تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

آفتاب اقبال شمیم کی نظم میں عصری حسیت

محقق:

نیل زہرا

193-FLL/MSURDU/F16

نگران:

ڈاکٹر شیراز فضل داد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

Accession No IH23446

MS
891.439
ل ی آ

اردو ادب - شاعری
" - نظم زنانی

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ نیل زہرا رجسٹریشن نمبر 193-FLL/MSURDU/F16 نے ایم۔ایس۔اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **" آفتاب اقبال شمیم کی نظم میں عصری حسیت "** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوااور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر شیراز فضل داد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Neel Zahra**

Title of the Thesis: آفتاب اقبال شمیم کی نظم میں عصری حسیت

Registration No: **193-FLL/MSURD/F16**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Dr. Abid Sial
AssociateProfessor
Department of Urdu , NUML, Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Humaira Ishfaq
Assistant Professor
Department Of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Shiraz Fazal Dad
Assistant Professor
Department Of Urdu, IIUI,

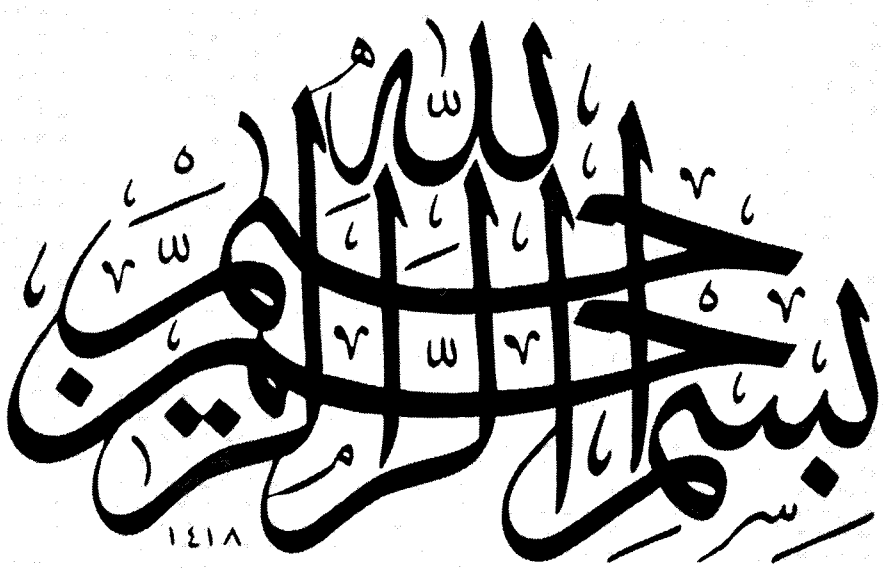
بسم الله الرحمن الرحيم
١٤١٨

پیش لفظ

یہ سب انسان پر اللہ رب العزت کا فضل و کرم ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی کام کو اس کی رحمت سے مکمل کر لیتا ہے۔ایم فل کا کورس مکمل کرنے کے بعد سب سے اہم مرحلہ تحقیقی مقالے کے لیے موضوع کی تلاش ہوتا ہے۔میں اپنے موضوع کے حوالے سے کافی پریشان تھی۔شاعری میں میری دلچسپی شروع ہی سے تھی۔شاعر مشرق کے اشعار ہمیشہ مجھے کسی اور ہی دنیا میں لے جاتے جہاں ان کے مرد مومن کی شان دیکھ کر میں سوچتی کہ مرد مومن کہاں چلا گیا؟۔ہماری خودی کو ہماری خواہشات کی دیمک چاٹ گئی۔ہم مغرب کی غلامی سے آزادی حاصل کیوں نہیں کر سکے؟ہمارا جذبہ ایمان اتنا کمزور کیوں پڑ گیا؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ قوموں کی ترقی و بقا میں استاد اہم کردار ادا کرتا ہے۔استاد کا مقام و مرتبہ اس وجہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے کہ وہ طالب علموں کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔میں اللہ رب العزت کی ذات کے بعد محمد ﷺ و آلِ محمد ﷺ اور اپنے شعبے کی محترم استاد ڈاکٹر شیراز فضل داد کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ جب میں اپنے موضوع کے حوالے سے کافی پریشان تھی تو ایک دن میں میم شیراز فضل داد کے پاس گئی۔میں نے ان سے موضوع کے حوالے سے رہنمائی چاہی تو انھوں نے مجھے جدید شاعری کے حوالے سے بتایا اور کہا کہ اس موضوع پر اچھا تحقیقی و تنقیدی کام سامنے آسکتا ہے۔اس کے بعد انھوں نے مجھے آفتاب اقبال شمیم کی شاعرانہ بصیرت اور ان کی نظم نگاری کے بارے میں بتایا۔یوں موضوع کے انتخاب کا مرحلہ طے ہوا۔

میرے تحقیقی مقالے کا موضوع "آفتاب اقبال شمیم کی نظم میں عصری حسیت" ہے۔مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔باب اول میں شاعری، نظم، جدید اردو نظم اور نظم کی اقسام بیان کی گئی ہیں۔اردو میں عصری حسیت کو مختلف نقادوں کی آراء کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔اس مقالے میں عصری حسیت کے تجزیے کے لیے احتشام حسین کی کتاب جدید اردو نظم میں عصری حسیت سے ایک نظری خاکہ تشکیل دیا گیا ہے جس کی مدد سے چاروں ابواب میں آفتاب اقبال شمیم کی نظم میں عصری حسیت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔باب اول میں اس نظری خاکے کے پہلے نقطہ کی روشنی میں آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کے موضوعات میں عصری حسیت کا مطالعہ کیا گیا ہے۔عصر حاضر میں جدید انسان ہی جدید نظم کا موضوع ہے۔سائنس اور ٹیکنالوجی نے جہاں انسان کو سہولیات فراہم کیں وہاں اس کی تباہی اور بربادی کا سامان بھی پیدا کیا۔

مقالے کا دوسرا باب "آفتاب اقبال شمیم کی نظم میں سامراجیت کے عناصر" ہے۔اس باب میں سامراجیت

کے تناظر میں نظموں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ سامراجیت سے مراد طاقت ور اقوام کا غریب اقوام پر غاصبانہ تسلط ہے۔ سامراجی طاقتوں نے غریب ممالک کے ہر شعبہ زندگی پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ تیسری دنیا کا ہر فرد سامراجی طاقتوں کا ذہنی اور جسمانی طور پر غلام ہے۔ آفتاب اقبال شمیم اپنی نظموں میں سامراجیت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ عالمی سطح پر سامراجی طاقتوں کے پھیلائے ہوئے جال کو اپنے تخیل سے شعری سانچے میں ڈھالتے ہیں۔

تحقیقی مقالے کا تیسرا باب "آفتاب اقبال شمیم کی نظم میں جدید انسان کا تصور" ہے۔ اس باب میں آفتاب اقبال شمیم نے عصری حسیت کے تناظر میں جدید انسان کے مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جدید انسان داخلی اور خارجی دنیاؤں میں تقسیم ہو گیا ہے جس سے وہ داخلی کشمکش، تنہائی، بے یقینی، اضطراب، اجنبیت، لاحاصلی، شکست و ریخت، ماحول سے عدمِ مطابقت اور وحشت میں مبتلا رہتا ہے اور وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنے کے بجائے وہ ان سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے۔

مقالے کا آخری باب "آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کے اسلوب میں عصری حسیت" ہے۔ اس باب میں انھوں نے تشبیہات، استعاروں، تراکیب، علامتوں، مکالماتی انداز اور انگریزی الفاظ کی معنویت کو اپنی نظموں کی ساخت میں منقلب کیا ہے۔ انھوں نے ان فنی محاسن کی مدد سے اپنے موضوعات کو گہرے اور منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔

میں اللہ رب العزت، محمد ﷺ و آلِ محمد ﷺ کے بعد اپنے والدین، اساتذہ، بہن بھائیوں اور دوستوں کی شکر گزار ہوں جن کی دعاؤں کی وجہ سے میں یہ مقالہ مکمل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ میں خاص طور اپنی نگران مقالہ ڈاکٹر شیراز فضل داد کی دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کیونکہ تحقیقی مقالے کے موضوع کے انتخاب سے لے کر مواد کی فراہمی اور تکمیل تک انھوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ میرے والد محترم ناصر الدین (ریٹائرڈ آفیسر انٹیلی جنس بیورو) کی شفقت اور حوصلہ افزائی ہر لمحہ میرے ساتھ رہی۔

میں سر کامران کاظمی، میم عاصمہ نذیر اور اپنے شعبے کے تمام اساتذہ کرام کی شکر گزار ہوں جنھوں نے ہمیشہ میری ہمت بندھائی۔ میری پیاری دوستیں ثنا اکبر اور کائنات منیر نے ہمیشہ مجھے مقالہ جلد مکمل کرنے کی طرف متوجہ کیے رکھا۔ میں خاص طور پر شکر گزار ہوں اپنے چھوٹے بھائی حسن مرتضیٰ کی جس نے تعلیم سمیت زندگی کے ہر مرحلے پر میرا ساتھ دیا۔

نیل زہرا

جنوری ۲۰۲۱ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	**باب اوّل:**	
	آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کے موضوعات میں عصری حسیت	۱
	حوالہ جات	۲۶
۲۔	**باب دوم:**	
	آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں سامراجیت اور ردِ سامراجیت	۲۸
	حوالہ جات	۵۲
۳۔	**باب سوم:**	
	آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں جدید انسان کا تصور	۵۴
	حوالہ جات	۷۷
۴۔	**باب چہارم:**	
	آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کے اسلوب میں عصری حسیت	۷۹
	حوالہ جات	۱۰۰
	ماحصل	۱۰۲
	کتابیات	۱۰۷

باب اوّل:

آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کے موضوعات میں عصری حسیت

باب اوّل:

آفتاب اقبال کی نظموں کے موضوعات: عصری حسیت

ادب میں کسی بھی معاشرے کا عکس دیکھا جاسکتا ہے اسی وجہ سے ادب میں معاشرتی زندگی کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ ادیب ادب کے ذریعے سے ہی معاشرے کے مثبت اور منفی رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اصلاحی پہلوؤں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ ہر مصنف اپنے تجربات اور مشاہدات کو اپنے ارد گرد کے ماحول سے حاصل کرتا ہے اور اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان تجربات اور مشاہدات کو ادب کا حصہ بناتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر تخلیق کار اپنے رجحانات اور فطری میلانات کے مطابق ہی خارجی دنیا سے اثر حاصل کرتا ہے۔

جہاں ادب معاشرے کا عکس پیش کرتا ہے وہاں ادب میں معاشرے کو متاثر کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہوتی ہے۔ ادیب ادب کے وسیلے سے ہی معاشرے کے مثبت اور منفی رویوں کی نہ صرف نشاندہی کرتے ہیں بلکہ اصلاحی پہلوؤں کی طرف رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ ادب کو یہ بھی امتیاز حاصل ہوتا ہے کہ یہ انقلابی سوچ اور انقلابی رہنمائی بھی رویوں کو جنم دیتا ہے۔

اردو ادب میں شاعری کی صنف کو تقویت و مقبولیت حاصل ہے۔ شاعری میں مختلف اصناف جیسے قصیدہ ،مثنوی، شہر آشوب، مرثیہ، غزل اور نظم پروان چڑھتی رہی ہیں۔ شعر و شاعری کی بنیاد تخیل پر ہوتی ہے۔ جتنا کسی بھی شاعر کا تخیل اونچا ہو گا اتنی ہی اعلیٰ شاعری تخلیق ہو گی۔ ان اصناف میں سے سب سے مشہور غزل اور نظم ہیں۔ نظم شاعری کی ایک ایسی قسم ہے جو کسی ایک عنوان کے تحت یا کسی ایک موضوع پر لکھی جاتی ہے۔ نظم کی ایک خاص صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں ہئیت کی کوئی قید نہیں ہوتی ۔ یہ بحر اور قافیہ کی بھی پابند بھی ہوتی ہے اور ان قیود سے آزاد بھی۔ اس صنف ادب میں مضامین کی وسعت ہوتی ہے۔ نظم زندگی کے کسی بھی موضوع کو اپنے احاطہ تحریر میں لے آتی ہے۔ نظم کو شیرازہ بندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نظم کے حوالے سے ہمارے ہاں یہ خیال شروع سے پایا جاتا ہے کہ شاعر خارج سے داخل یا کائنات کے مشاہدے سے اپنی ذات کی طرف سفر کرتا ہے اور اس سفر کا استعارہ نظم ہے۔ نظم کا شجرہ تقسیم ہو کر مختلف صورتیں پیدا کرتا ہے۔ مسدس، مخمس، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، قطعہ ،ترکیب بند، ترجیع بند، نظم معرا، نظم آزاد، سانیٹ وغیرہ نظم کی ہی قسمیں ہیں۔

خواجہ محمد اکرام الدین اپنی کتاب اردو کی شعری اصناف میں نظم کے مطابق:

لفظ نظم نثر کے مقابلے میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ شاعری کی دیگر اصناف کے مقابلے میں جب لفظ نظم کا استعمال ہوتا ہے تو اس سے ایک خاص صنف مراد لی جاتی ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر اور وسیع ترین صنف ہے جو مختلف ہئیتوں میں لکھی جاتی رہی اور دنیا بھر کے تمام موضوعات اس کی بساط میں سمٹتے رہے ہیں۔ جدید اردو شاعری میں غزل کے بعد بلکہ غزل کے دوش بدوش چلنے والی کوئی صنف ہو سکتی ہے تو وہ اردو نظم ہی ہے۔[1]

اردو نظم میں بہت سے تجربے اس کی وسعت کی دلیل ہے۔ نظیر اکبر آبادی، الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، ساحر لدھیانوی، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، ن م راشد، اسماعیل میرٹھی نظم کے بڑے شاعروں میں سے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدا میں اردو نظم میں ہئیت کے تجربے کیے گئے۔ انگریزی نظموں کی بنیاد پر قافیہ ردیف کے استعمال میں جدت لائی گئی۔ اگر نظم کی اقسام کے حوالے سے بات کی جائے تو اس میں پابند نظم، طویل نظم، معرا نظم، آزاد نظم اور نثری نظم شامل ہیں۔

پابند نظم غزل کی طرح بحر و قافیہ کی پابند ہوتی ہے۔ ابتدائی دور میں زیادہ تر پابند نظمیں ہی کہی جاتی تھی جیسے اقبال کی "مکڑی اور مکھی"، "پرندہ اور جگنو" اور "ماں کا خواب" پابند نظم کی مثالیں ہیں۔ قصیدہ، مرثیہ یا مثنوی طویل نظم کی مثالیں ہیں۔ مثنوی قصیدے اور مرثیے کی نسبت طویل ہوتی ہے اور ایک ہی وقت میں ایک مثنوی میں کئی کہانیاں بیان ہوتی ہیں چونکہ مرکزی کہانی ایک ہی ہوتی ہے اس لیے اگر مثنوی مختصر کہانیوں کا مجموعہ نہیں تو ایک طویل نظم ضرور ہوتی ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ طویل نظم صرف مرثیہ، قصیدہ یا مثنوی ہو بلکہ بہت سی فکری نظمیں بھی طویل نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔ علامہ اقبال، حالی، جوش، علی سردار جعفری اور ساحر لدھیانوی نے طویل معیاری نظمیں لکھی ہیں۔ اقبال کی طویل نظموں کی مثالیں "شکوہ"، "جواب شکوہ"، "ابلیس کی مجلس شوریٰ"، "ساقی نامہ" وغیرہ ہیں۔

معریٰ نظم کو انگریزی میں Blank Verse کہا جاتا ہے۔ یہ نظم کسی مخصوص بحر میں کہی جاتی ہے مگر اس میں قافیہ نہیں ہوتا۔ اس میں بحر اور وزن کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ معریٰ نظم کا ایک عنوان بھی ہوتا ہے۔ اردو زبان میں نظم معریٰ کی روایت انگریزی زبان سے منتقل ہوئی۔ معریٰ نظم کے اہم شعرا میں تصدق حسین، میراجی، ن م راشد، فیض احمد فیض، یوسف ظفر، مجید امجد اور ضیا جالندھری قابل ذکر ہیں۔ آزاد نظم کو انگریزی میں Free Verse کہا جاتا ہے۔ معریٰ نظم میں قافیے کی شرط نہیں ہوتی جب کہ اس کے مصرعے یکساں ہوتے ہیں لیکن آزاد نظم میں فقرے چھوٹے بڑے ہو سکتے ہیں۔ اس نظم کی بنیاد ایک بحر ہوتی ہے۔ آزاد نظم میں ہئیت کے اعتبار سے مختلف تجربات کیے گئے ہیں۔ بعض شعرا نے آہنگ اور صوتی تاثر کا خیال رکھا ہے اور کہیں کہیں قافیے بھی استعمال کیے

ہیں۔ نثری نظم مکمل آزاد صنف ہے۔اس میں وزن، قافیے اور ردیف کی پابندی نہیں کی جاتی لیکن شعریت کا عنصر ضرور موجود ہوتا ہے اسی لیے اسے نظم کے درجے میں رکھا جاتا ہے۔ نظم کی یہ صنف بھی اب مقبول ہو رہی ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب معاشرہ مختلف تبدیلیوں سے گزرتا ہے تو انسانی دماغ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ جب انسانی ذہن میں تبدیلیوں کا آغاز ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں فکر و خیال کے نئے نئے گوشے رونما ہوتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستانی معاشرہ جس سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی انقلاب و انتشار سے دوچار ہوا اس نے ہمارے مفکروں، دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کیے ۔جدید نظم داخلی صنف ہے۔ جدید اردو نظم کا آغاز بھی اسی دور میں ہوا۔ جنگ آزادی سے جو حالات پیدا ہوئے تھے اس سے نیا احساس بیدار ہوا، نئے شعور نے آنکھ کھولی اور نئے مسائل و معاملات وجود میں آئے۔ ایک نیا نظام قائم ہوا ،ایک نئے معاشرے کی بنیاد پڑی اور ایک نئی تہذیب کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ جہاں اسے نئے نظام نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا وہاں شاعری بھی اس کے اثرات سے بچ نہیں سکی۔ جدید اردو نظم کی تحریک کے سلسلے انجمن پنجاب نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ اگر جدید اردو نظم کے موضوعات کے حوالے سے بات کی جائے تو ان موضوعات کی کوئی حدود نہیں ہے۔ جدید اردو نظم کا موضوع حیات و کائنات ہے۔ جس طرح حیات و کائنات کا دامن وسیع اور پھیلا ہوا ہے اسی طرح نظموں کے موضوعات کی کوئی حد نہیں۔

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد اصناف ادب :تفہیم و تعبیر (منتخب تنقیدی اقتباسات) میں نظم اور نئی نظم کے حوالے مختلف نقادوں کا احاطہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"آزاد نظم فن کے قیود سے آزادی کا نام نہیں بلکہ فن کے ساتھ ایک تازہ اور دوسروں سے زیادہ گہری وفاداری کا نام ہے۔ یہ چند معمولی قیود سے آزادی اس لیے حاصل کرتی ہے کہ بعض گہری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکے "(آل احمد سرور)

"نظم بنیادی طور پر تاثرات کے تجزیاتی مطالعے کا ایک وسیلہ ہے اور اس خاص میدان میں اس کا کوئی حریف نہیں"(وزیر آغا)

"نئی نظم کے شاعر کی ذمہ داریاں پہلے شاعروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں"(جیلانی کامران)

"نئی نظم کی اساس تجربے پر ہے اور اس لحاظ سے منفرد ہے کیوں کہ اس کا تجربہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے وسیع فکری منطقوں سے تعلق رکھتا ہے اور رونمائی کے اعتبار سے ایک ہی وقت میں مختلف زاویوں سے اپنی شباہت کو پیدا کرتا ہے "(جیلانی کامران)

"نظم کا لسانی پیکر شعری زبان، علامتوں اور استعاروں سے مل کر پیدا ہوتا ہے اور یہ اجزا فکری نظام اور شاعر کی تہذیبی تربیت سے براہ راست وابستہ ہوتے ہیں" (جیلانی کامران)

"جدید نظم کی امتیازی خصوصیات اس کا تمثیلی انداز ہے" (ریاض احمد)

"اردو میں نظم کی تخلیق براہ راست انگریزی شاعری کے اثرات کا نتیجہ ہے لیکن یہ ایک حد تک روایت کے خلاف بغاوت کا نتیجہ تھی اور روایت سے زیادہ غزل اور گیت کے خلاف رد عمل تھا" (ن۔م راشد)

آزاد نظم کے بعد جدید اردو نظم میں سب سے بڑا ہیئتی تجربہ نثری نظم کی صورت میں ہوا۔ اسے آسانی سے نظم کی ارتقائی کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔ نظم معریٰ سے قبل قافیے کے بغیر نظم کہنے کا تصور نہیں تھا۔ آزاد نظم سے قبل عروضی آہنگ کو منقسم کرنے کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا، نظم نے پہلے قافیے سے آزادی حاصل کی، پھر متعین عروضی پیٹرن سے آزادی حاصل کی اور پھر عروضی آہنگ سے آزاد ہوئی" (ڈاکٹر ضیاالحسن)

"جدید اردو نظم بھی میرے نزدیک مختلف انسانی جزیروں میں سے ایک سرسبز جزیرہ ہے" (بلراج کومل) [۲]

جدید نظم کی طرف جانے سے پہلے ضروی ہے کہ ایک سرسری نظر جدیدت پر ڈال لی جائے۔ جدیدیت کو ایک اصطلاح کے طور پر سب سے پہلے انیسویں صدی کے اواخر میں کیتھولک عقائد کی قدامت پرستی کے خلاف روشن خیالی کی تحریک کے پس منظر میں استعمال کیا گیا۔ ہر وہ رویہ جو زندگی کی پرانی قدروں سے گریز اور نئی قدروں کی جستجو کا پتہ دے، وہ جدید ہے۔ جو انداز نظر اپنے زمانے کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور ماضی سے یگانگت اور ہم آہنگی محسوس نہ کرے گویا وہ جدیدت کا حامل ہے۔ جدید کا لفظ اسی وقت اہمیت کا حامل ہوتا ہے جب وہ نئے کے ساتھ ساتھ کسی ایسے معانی کا حامل ہو جو زندگی کے ادراک میں ایک نئی جہت کا اضافہ کرے۔ کسی نئے رخ کو سامنے لا رہا ہو۔ جدیدیت تنقید کی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد نیا پن، انوکھا پن اور اچھوتا پن ہے۔ وہ نقطہ نظر، طرز احساس اور طرز فکر جس کی بنیاد میں جدید عناصر پائے جاتے ہوں۔ ادب میں جدیدیت کا مفہوم زمان و مکاں کی تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔ جدیدیت میں کسی نظریے کی پابندی نہیں ہوتی۔ اس میں کسی فرد کے اپنے وجود کی اہمیت مقدم ہے۔ جب ایک انسان کا وجود ہی باقی نہیں رہے گا تو سماجی شعور، اجتماعیت اور مقصدیت تو بے معنی چیزیں رہ جاتی ہیں۔ تو اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدیدیت کا تعلق اجتماعیت سے نہیں بلکہ فرد کی فردیت تک محدود ہے۔

ڈاکٹر وحید اختر جدیدیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ جدیدت کی مختصر ترین تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ یہ اپنے عہد کی زندگی کا سامان کرنے اور تمام خطرات و امکانات کے ساتھ برتنے کا نام ہے۔ ہر عہد میں جدیدت ہم عصر زندگی کو سمجھنے اور برتنے کے مسلسل عمل سے عبارت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے جدیدیت ایک مستقل عمل ہے جو ہمیشہ

جاری رہتا ہے۔ ہر عہد میں ان لوگوں نے جو حقیقی طور پر زندہ ہیں، اس عمل میں حصہ لیا۔ انھوں نے فکر و فن کی سطح پر فرسودہ اقدار کے خلاف جنگ کر کے نئی قدروں کی پرورش کی اور عملی زندگی کو بھی نئے سانچوں میں ڈھالا ہے۔ اسی مفہوم میں ادب کو روح عصر کہا جاتا ہے۔ جدیدیت کی بحث میں مغالطہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس عمل کو جدیدیت کا کل مفہوم سمجھ لیا جاتا ہے۔ اپنے زمانے میں ہر بڑا ادب جدید رہا ہے لیکن غالب کے عہد کی جدیدیت جن عناصر سے عبارت ہے وہ مختلف ہیں اور ہمارے عہد کی جدیدیت کے عوامل مختلف ہیں۔[۳]

اگر جدیدیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو جدید شاعری در حقیقت وہ شاعری ہے جو کسی انقلابی انداز میں سے بدلتے ہوئے ماحول کے صحیح ترجمانی میں خود اپنے آپ کو بدل دے۔ اس میں کسی بات کو محسوس کرنے، سوچنے اور بیان کرنے کا انداز نیا ہو یعنی کوئی شاعر روایتی بندھنوں سے الگ رہ کر احساس، جذبے یا خیال کے اظہار میں اپنی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہو تو وہ نیا شاعر ہوگا۔ ماضی کے پس منظر میں اردو ادب کے ایسے بہت سے نامی گرامی شاعر موجود ہیں جن پر جدیدیت اور جدید شاعری کی اس تشریح کا اطلاق ممکن ہے۔ جیسے نظیر اکبر آبادی اور مرزا غالب بہت حد تک اپنے اسلوب، اظہار اور فکر و احساس کے لحاظ سے جدید شاعر کہے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ ان دونوں کے ہاں ہی نئی شعری قدروں کے نشان ملتے ہیں۔ مقدمہ شعر و شاعری میں مولانا حالی نے قدیم شعری سرمایے پر کئی حوالوں سے اعتراض کیے اور نئی شاعری کے لیے نئے ضابطے دیے۔ انھوں نے نئی شاعری کے لیے کئی ایسے عناصر کا ذکر کیا جو نئے دور کے تقاضوں کے مطابق ہوں۔ حالی نے مبالغے کے بجائے سادگی، اصلیت اور جوش پر زور دیا۔ نئے شعری اسلوب کے لیے انھوں نے خصوصاً سادگی پر توجہ دی۔ ان کا خیال تھا کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو اسے روزمرہ کے بول چال کے الفاظ میں پیش کیا جائے۔ اردو ادب کو عمدہ بنانے کے اسی خیال نے جدید اردو نظم کو ایک بنیاد فراہم کی اور شعرا نے نئے دور کے تقاضوں کے مطابق نئے شعری موضوعات پر نظمیں کہیں۔ اس دور کو ہم جدید اردو نظم کا تشکیلی دور یا پیش رو دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور کے نمائندہ شعراء محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی شبلی نعمانی، اسماعیل میرٹھی، اختر شیرانی، نظیر اکبر آبادی، احسان دانش، حفیظ جالندھری، محمد دین تاثیر اور علامہ اقبال ہیں۔

امجد علی شاکر کے مطابق ۱۹۶۰ء میں نئی شاعری کی تحریک کا آغاز ہوا۔ نئی شاعری کے علمبرداروں نے ہر طرح کلاسیکی فارملزم کو رد کر دیا اور نئی شاعری میتھڈولوجی کو جنم دیا۔ نئی شاعری نے شاعری کے نئے منظر نامے کو تخلیق کیا جس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

☆ ماضی سے علیحدگی خصوصاً قدیم اقداری نظام سے بغاوت

☆ سیاسی اداروں کے جبر کے خلاف رد عمل کے لیے نئی علامتوں، استعاروں اور تشبیہات کی تخلیق

☆ ہر طرح کے موضوعات کا شاعری میں داخلہ

☆ ناقابل بیان کے لیے نئے لسانی پیکر کی تلاش

☆ الفاظ کو نئے سیاق وسباق میں پیش کرنا

☆ آزاد نظم کو اپنی توجہ کا مرکز بنانا

☆ ذاتی اور موضوعی شعری لسانیات کی تشکیل

☆ شاعری میں ترسیل معنی کے بجائے تشکیل معنی

نئی شاعری کے شاعروں میں اہم شعراء یہ ہیں:

انیس ناگی، جیلانی کامران، افتخار جالب، عباس اطہر، سلیم الرحمٰن، زاہد ڈار، کشور ناہید احمد شمیم، آفتاب اقبال شمیم اور عبدالرشید ہیں۔[۴]

جدید اردو نظم میں نئے شعری اسالیب نے جنم لیا۔ان میں کردار نگاری کا اسلوب سب سے منفرد ہے۔ جدید نظم کے اس اسلوب میں نظم کہنے کا ایک واضح سبب اردو شعرا کا مغربی ادبیات کا مطالعہ ہے۔ایسا اسلوب پہلی مرتبہ علامہ اقبال کے ہاں نظر آتا ہے۔ن۔م راشد نے اسے مستقل ذریعہ اظہار بنا کر اس کے امکانات کو وسعت دی مثلاً علامہ اقبال کی شاعری میں ابلیس کا کردار ایک ایسا انقلابی کردار ہے جو فطرت کے جدلیاتی نظام میں اثبات کے مقابلے میں نفی کی طاقت ہے اور یہ طاقت ہمیں ہر زمان ومکاں میں برسرپیکار نظر آتی ہے لیکن یہ امر دلچسپی کے قابل ہے کہ اقبال کی شاعری میں ابلیس کا کردار پہلی بار کسی منفی حوالے کے بجائے ایک مثبت زاویے سے ابھرتا ہے۔

نئے شاعروں نے اپنی شاعری میں علامت نگاری کو خصوصی اہمیت دی۔جدید شعرا نے لسانی علامتوں کی بجائے امیجز سے علامتیں اخذ کیں۔یہ علامتیں جدید زندگی کی بے معنویت کی تہہ در تہہ کیفیتوں کی وضاحت کرتی ہیں ۔علامت نگاری کے ساتھ ساتھ جدید شاعروں نے معروض کو اہمیت دی۔جدید شاعر موضوع کو ایسے بیان کرتا ہے جیسے معروض ہو اور معروض کو موضوع بنالیتا ہے۔نئی شاعری میں منطقی ترتیب نہیں ملتی بلکہ اس کے بجائے آزاد تلازمۂ خیال کی ترتیب ملتی ہے۔جدید شاعروں کے ہاں امیجری کو بھی خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ہمیں قدیم شاعری میں بھی امیجری ملتی ہے مگر وہ صرف نمائشی ہے۔وہ اصل موضوع کے ارد گرد کا حاشیہ ہے۔قدیم شاعری میں امیجز ذریعہ ہیں مگر جدید شاعری میں امیجز مقصد ہیں۔مثلاً منیر نیازی بہت خوبصورت امیجز استعمال کرتے ہیں۔

جدید شعرا روایتی موضوعات سے انحراف کے باعث لسانیات کے مروجہ ڈھانچے سے بھی گریز پا ہوئے۔ ان شعراء کا یہ عقیدہ تھا کہ جہاں کہیں بھی نئے اور عظیم موضوعات شاعری کا حصہ بنیں گے تو اس سے بنی بنائی زبان کو

ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ شعری زبان کے اس جدید طریقہ اظہار کو انھوں نے لسانی تشکیلات کا نام دیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ کلاسیکی اور روایتی زبان، فقروں کی ساخت، استعارے اور علامتیں نئے موضوعات اور خیالات کو بیان نہیں کر سکتے اس لیے نئی اور منفرد سوچوں کے بیان کے لیے زبان کے ڈھانچے میں تبدیلی ضروری ہے۔ جدید نظم نگاروں کی نظموں میں ابہام پایا جاتا ہے۔ جدید نظم میں ڈرامائیت بھی پوری طرح موجود ہے۔ جدید شاعروں کا مکالماتی انداز بیاں جدید نظم کو مزید دلچسپ بنا دیتا ہے۔

جدید نظم کا بنیادی موضوع انسان ہے۔ نئی دنیا کا انسان ایک جزیرے میں قید ہے اس پر تنہائی کا احساس اور موت کی خوفناکی حاوی ہے۔ انسان اکیلا ہے اور نت نئے ہتھیاروں کی ایجادات سے طاقتور ہے۔ موت کا کھیل کبھی جنگوں کی شکل میں برپا ہوتا ہے اور کبھی امن و سلامتی چاہنے والے لوگوں پر بمباری کی شکل میں۔ تیسری دنیا کے ممالک میں عالمی طاقتوں کی بے جا دخل اندازی سے پیدا ہونے والی سامراجی صورت حال جدید نظم کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ اس سامراجی صورت حال نے فرد کی شناخت کے مسئلے کو جنم دیا ہے۔ سیاسی عدم استحکام نے معاشی بے یقینی کی صورت حال کو جنم دیا ہے جس سے جدید انسان حال اور مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا ہے۔ ٹیکنالوجی کی ترقی نے جدید انسان کو تنہا کر دیا ہے۔ وہ موبائل کے ساتھ اتنا مصروف ہے کہ اسے اپنے ارد گرد کی دنیا کی کوئی خبر ہی نہیں۔

مظفر ایوبی اپنی تصنیف اردو شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش میں رقمطراز ہیں کہ جدید شاعری کے موضوعات میں قحط، بھوک، افلاس، بیماری، بے روزگاری، تباہ کاری، موت، جہالت، مزدور، غیر طبقاتی نظام، سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی، مظلومیت اور انسانیت اور عالمی صورت حال شامل ہیں۔

ادب میں کہانی ہو یا شاعری انہیں سمجھنے کے لیے محققین و ناقدین نے بے شمار نظریات متعارف کروائے ہیں جو جدید تنقیدی مباحث کہلاتے ہیں جن میں سے ایک موضوع "عصری حسیت" کا ہے۔ یورپ میں اٹھارھویں صدی کے اواخر میں اصناف ادب میں ناول پر حسیت کا دخل نظر آیا ہے۔ منطقیت کے رد عمل میں سامنے آنے والی تحریک ادب کو متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ مغربی ناقدین نے حسیت کو جذباتیت کا ہم پلہ قرار دیا۔ یہاں اس رجحان کی طرف نظم میں ولیم کاپر فلسفے کے حوالے سے روسو اور گوئٹے ناول کے حوالے سے سموئیل رچرڈسن اور جی۔ جے بارکر بین فیلڈ کے نام اہم ہیں۔

انیسویں صدی میں حسیت کی بارآوری نظر آتی ہے۔ اسی اثناء میں حسیت نے ادب کی جس صنف کو زیادہ متاثر کیا وہ ناول ہے۔ جی۔ جے بارکر بین فیلڈ، چارلس ڈکنز، گستاؤ فلابیر اور مارک ٹوئن کے ہاں حسیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں احتشام علی اپنی کتاب جدید اردو نظم میں عصری حسیت میں

جی۔ جے بار کر بین فیلڈ کا حوالہ نقل کرتے ہیں کہ انیسویں صدی میں حسیت اور جذباتیت ہر سطح پر پھلنے پھولنے لگی۔ مختلف براعظموں اور نئی دنیاؤں میں یہ، گوتھک، اینٹی گوتھک، رومانوی اور حقیقت پسندانہ رویوں میں ڈھل کر اپنا اظہار کرنے لگی۔[۶]

انیسویں صدی میں ناول میں حسیت نے جس طرح اپنے اثرات ثبت کیے اسی طرح بیسویں صدی میں بھی اس رجحان سے ادب متاثر رہا ہے۔ بالخصوص جدید شاعری (نظم) میں حسیت کا اثر نمایاں رہا ہے۔ بیسویں صدی میں حسیت کے بہت سے نئے انداز اور مفاہیم سامنے آئے لیکن جدید شاعری کے حوالے سے بیسویں صدی کی دنیا کو سمجھنے کے لیے حسیت ہماری مدد کرتی ہے۔

مغربی ادب کا سرسری سا جائزہ لینے کے بعد اردو ادب کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی بھی عہد میں عصری حسیت فن پاروں کی بالائی ساخت تک رسائی سے قاصر رہی ہے۔ ایک سچا تخلیق کار داخلی و خارجی استنباط شدہ تجربے جو انفرادی اور اجتماعی ہر دو طرح سے خود پر یوں وارد کرتا ہے کہ یہ اس کے اپنے تجربات نظر آتے ہیں اور حس تخلیق یا تخلیقی صلاحیتوں کے رہین انہیں ادب کی شکل میں منتقل کرتا ہے۔ خارج سے اثر حاصل کر کے انہیں ادب میں منتقل کرنے کا عمل "عصری حسیت" کہلاتا ہے۔

اردو ادب میں عصری حسیت جدید تنقیدی مباحث کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ اردو ادب کے صاحبان بصیرت محققین و ناقدین نے عصری حسیت کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ کئی شاعروں اور ادیبوں کے کلام پر اس حوالے سے ناقدین بالخصوص احتشام علی، حامدی کاشمیری اور سعید احمد نے طبع آزمائی کی ہے۔ مختلف ناقدین و محققین کی عصری حسیت کے بارے میں آرا درج ذیل ہیں:

پروفیسر انور جمال حسیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

> حسیت وہ صلاحیت ہے جو فرد میں بیرونی ہیجانات سے متاثر ہوتی ہے۔ ادب میں یہ اصطلاح جدید حسیت کے نام سے متعارف ہوئی اور اس کے معنی یہ لیے گئے ہیں کہ جدید شاعر و ادیب اپنے گردو نواح کے حالات کو کس سرعت اور قوت کے ساتھ حواس میں وصول کر کے اس کو تخلیقی تجربہ بناتا ہے۔[۷]

احتشام علی عصری حسیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ادبی سیاق میں عصری حسیت کسی مخصوص عہد میں صورت پذیر ہونے والے متن کی بالائی ساخت کی بازیافت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اصطلاح ایک وسیع تر تناظر میں ادبی متن کی زیریں ساخت میں

جا گزیں اس تہہ نشیں نظام کو نشان زد کرتی ہے جس میں عصر ایک نامیاتی کل کے طور پر اپنا ادارک کرتا اور ایک سچا تخلیق کار اپنے عصری شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی بھی انفرادی یا اجتماعی تجربے کو اپنی فہم اور حسیات کے ذریعے تخلیقی مواد میں منقلب کر لیتا ہے۔[8]

ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق:

ادب کو اپنے عصر سے منسلک ہونا چاہیے اور اس سے ماورا بھی۔ جب ہم ادب کا مطالعہ کریں تو ہمیں محسوس ہو کہ ادیب نے اپنے عصر کو وارداتی سطح پر محسوس کیا ہے اور اس کے تجربات (شخصی اور اجتماعی) سے گزرا ہے یا کم از کم اس نے ان تجربات کو خود پر اس طور وارد کر لیا ہے کہ یہ اس کے اپنے تجربات بن گئے ہیں۔ اسی شے کو عصری حسیت (Modern Sensibility) کا نام ملا ہے۔[9]

نئی شاعری اور جدید حسیت کے حوالے سے منظر اعظمی لکھتے ہیں:

نئی شاعری تحریک نہیں ہے اس لیے اس کا کوئی دستور العمل نہیں، کوئی قاعدہ نہیں اور کوئی لگا بندھا نظریہ اور طریقہ کار نہیں۔ یہ تو ایک ایسا ذہنی رویہ، طرز احساس اور جدیدیت کی ایسی رو ہے جو کسی تقلید، کسی اصول اور ضابطے کی قائل نہیں۔ ایک آزادانہ احساس کا آزادانہ اظہار ہے۔ انحراف و انقطاع کی روش ہے جس کو جدید حسیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ایک شدید احساس جس میں شکست و ریخت کا احساس اور عمل تیز تر ہے۔ مگر کچھ ایسی نئی قدروں کی تلاش کا جذبہ بھی ہے جو انسان کے باطن کے زنگ کو دور کر کے پھر سے اسے معصوم اور منزہ بنا دے۔[10]

احتشام علی نے اپنی کتاب جدید اردو نظم میں عصری حسیت کے اہم عناصر کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ احتشام علی نئی نسل کے ابھرتے ہوئے نقاد ہیں۔ جدید اردو نظم کے عہد بہ عہد ارتقاء اور تغیرات پر ان کی گہری اور ناقدانہ نظر ان کی اعلیٰ تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین ملک کے ادبی جرائد و رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ جدید شاعری خصوصاً اردو نظم کے حوالے سے ان کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ احتشام علی نے ۲۰۱۱ء میں گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی لاہور سے "معاصر اردو نظم" پر مقالہ لکھ کر ایم۔فل کی ڈگری حاصل کی۔ اب پنجاب یونی ورسٹی اورنٹیئل کالج سے جدید اردو نظم: مابعد نوآبادیاتی تناظر کے زیر عنوان پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں "ہمسفر کوئی نہیں" کے نام سے شعری مجموعہ: کاغذی پیرہن لاہور سے شائع ہوا تھا۔

احتشام علی نے اپنی کتاب جدید اردو نظم میں عصری حسیت میں جدید اردو نظم کی شعریات کو ایک انفرادی زاویہ نظر سے دیکھا ہے۔ ان کے مطابق معاصر تنقید میں عصری حسیت یا جدید حسیت جیسی اصطلاحوں کا ایک محدود معنی میں کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے اور اس دوران عصر یا جدت کو طے شدہ زمانی اکائی

تصور کیا جاتا ہے۔ زیر نظر کتاب کے پہلے باب میں عصری حسیت کو بطور اصطلاح استعمال کرنے سے قبل عصر (زمانہ) کو ایک ایسے نامیاتی کل کے طور پر نشان زد کیا گیا ہے جس کا تعین لمحہ نا موجود اور لا موجود کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یہاں عصر سے مراد وہ روح عصر (Spirit of Time) ہے جو کائنات کے ذرے ذرے سے لے کر شعور کے ریشے ریشے تک میں موجزن ہے۔ باب اول میں عصری حسیت کے معنی، حدود اور امکانات کا تعین کرتے ہوئے سترھویں صدی کے مغربی ادب میں منظر عام پر آنے والی اس حسیت کی تحریک کے تدریجی ارتقا پر بھی طائرانہ نگاہ ڈالی ہے۔ باب دوم میں جدید اردو نظم کی روایت کو عصری حسیت کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باب سوم میں آزادی کے بعد لکھی جانے والی جدید اردو نظم کا احاطہ کرتا ہے۔ کتاب کے آخری باب میں مابعد جدید حسیت اور معاصر اردو نظم میں ان مابعد جدید حسی عناصر کو بیان کیا ہے۔ زیر نظر تحقیقی مقالے میں آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں عصری حسیت کے عناصر کے مطالعے کے لیے احتشام علی کی کتاب جدید اردو نظم میں عصری حسیت سے درج ذیل نظری خاکہ اخذ کیا گیا ہے۔

جدید اردو نظم کے موضوعات میں عصری حسیت کے عناصر کا تعین:

عصر حاضر میں جدید انسان ہی جدید نظم کا موضوع ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی نے جہاں انسان کو پر آسائش زندگی فراہم کی وہیں اس کی تباہی اور بربادی کا باعث بھی بنی ہے۔ عالمی جنگیں اور ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال سائنسی ترقی کی دین ہے۔ انسان پر جنگ کا خوف کسی پراسرار مخلوق یا خلا سے اترے افراد مسلط نہیں کرتے بلکہ انسان خود ہی اس آگ کے پھیلاؤ کا باعث بنتا ہے۔ تیسری دنیا کی اقتصادی صورت حال نے فرد کے لیے بہت سے مسائل کو جنم دیا ہے جن میں بھوک، قحط، ظلم و تشدد، افلاس اور تنگدستی، انتشار، تنہائی، اجنبیت اور کرب کا احساس، معاشرتی، روحانی اور تہذیبی اقدار کا زوال شامل ہیں۔ طبقاتی تقسیم نے معاشرتی ناہمواری کو جنم دیا ہے جس سے جدید انسان میں انتشار اور اضطراب کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔

جدید اردو نظم میں سامراجیت کی عصری حسیت:

نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد غلامی کی بدلتی ہوئی شکل سامراجیت کہلاتی ہے۔ عہد جدید کے انسان کو سامراجیت کی اس گنجلک صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے کیونکہ سامراجی طاقتوں نے تیسری دنیا کے ہر شعبہ زندگی پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ امریکہ میں نائن الیون، عراق اور افغانستان پر امریکہ کا حملہ، القاعدہ کی کاروائیاں، طالبان کے خود کش حملے، دہشت گردی، موت کا خوف سامراجیت

کے رخ ہیں۔ تیسری دنیا کا ہر فرد سامراجی قوتوں کا ذہنی طور پر غلام ہے۔

عصری حسیت کے تناظر میں جدید انسان کا تصور:

عصر حاضر کا انسان جدید ٹیکنالوجی کے استعمال کی وجہ سے اپنے گردہ نواح کی دنیا سے لاتعلق رہتا ہے۔ جس سے وہ داخلی کشمکش، تنہائی، بے یقینی، اضطراب، اجنبیت، لاحاصلی، شکست و ریخت، ماحول سے عدم مطابقت اور وحشت کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنے کی بجائے وہ ان سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے اور اپنی بے انتہا خواہشات کا اسیر ہے۔ مستقبل کے واہموں اور خوف میں جکڑا رہتا ہے۔

جدید نظم کی اسلوب میں عصری حسیت کی کارفرمائی:

اسلوب سے مراد طرز بیان، طرز سخن اور طرز اظہار لیا جاتا ہے۔ ہر شاعر اور ادیب کا اپنا مخصوص اور منفرد انداز تحریر ہوتا ہے۔ اسلوب مختلف ہونے کی وجہ سے ہر ادیب اور شاعر کا اپنا ایک خاص لہجہ ہوتا ہے۔ نئے شاعروں نے گنے چنے مضامین کا انتخاب چھوڑ کر نئے امیجز، تشبیہات، استعاروں، تراکیب، علامتوں، مکالماتی انداز، ڈرامائی انداز اور انگریزی الفاظ کی معنویت اپنی نظموں کی ساخت میں منقلب کیا۔ جدید نظمیں شدید ذہنی اور روحانی انتشار کا بیانیہ ہیں۔

مذکورہ نظری خاکہ جدید اردو نظم میں عصری حسیت سے اخذ کیا گیا ہے۔[11]

آفتاب اقبال شمیم ۱۹۳۳ء کو جہلم میں پیدا ہوئے۔ ان کے گھر کا ماحول ادبی تھا۔ ان کے والد صاحب ایک رسالے کے ایڈیٹر تھے۔ آپ کو بچپن سے ہی کہانیاں سننے کا شوق تھا۔ راولپنڈی اصغر مال کالج میں سال دوم کا طالب علم تھا تو پروفیسر صفدر حسین نے انہیں کالج میگزین کوہسار کا پہلا اسٹوڈنٹ ایڈیٹر نامزد کیا۔ یوں آفتاب اقبال شمیم اپنے اساتذہ کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ ان کے ادبی اور تخلیقی سفر کا آغاز اس زمانے سے شروع ہوا جب انھوں نے اقبال کے مرد مومن کا دھندلا سا تصور اختر شیرانی کی عذرا، سلمیٰ اور ریحانہ کی رومانوی دنیا میں دیکھا۔ پہلے آپ اقبال اور اختر شیرانی کے حصار میں تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ فیض احمد فیض اور ن۔م۔ راشد سے متاثر ہونے لگے۔ ان دو شاعروں کا تخلیقی عمل اور داخلی مکالمہ ان کی عصریت اور عصری طرز حسیت کا محتاج تھا اور عصریت ہی وہ لازمہ ہے جو روایت کے تسلسل کو برقرار رکھتا ہے۔ آفتاب اقبال شمیم فکری سطح پر ن۔م۔ راشد کی ناآسودگیوں کے ادراک، مضطرب کر دینے والے رجحان اور تاریخ کے جبریت کے احساس سے متاثر تھے۔ اسی طرح فیض احمد فیض کی شاعری میں مظلوم و محکوم کے ساتھ یکجہتی، عالمی سطح پر استعمار سے آزادی کی جو جہد کرنے والے ایشیائی، افریقی اور

لاطینی امریکی ممالک کی حمایت اور حسن وانقلاب کو ایک ہی شعر میں سمونے کی جمالیاتی کاوش کو اپنی فکری بالیدگی میں سمو لیتے تھے۔

آفتاب اقبال شمیم نے جب نظم لکھنی شروع کی تو اس وقت ان کی نظم کا ایک ہی موضوع ہوتا تھا۔ اپنے عنوانات کی پیروی کی سیدھ میں چلتے تھے۔ اختصار کی بجائے تفصیل پسند تھے، ابہام سے قصداً گریز کرتے تھے۔ تشبیہ واستعارہ اور تمثال سے آرائشی کام لیتے تھے۔ جب نئی نظم کا دور شروع ہوا تو نئی نظم کی اس تحریک نے نئے نظم نگاروں میں نیا تجربہ کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ یہ بھی ہوا کہ وہ شاعری کی عالمی تحریکوں سے روشناس ہوئے اور نظم نئے دم خم کے ساتھ نئے تجربوں کے مراحل میں داخل ہوئی۔ نظم آدمی کی سائیکی کے گم نام گوشوں سے لے کر کائنات کی وسعت تک سفر گیری میں رہتی اور آدھا آدمی پورے آدمی کی جستجو میں نکلتا، تلازمے کی راہوں سے نکلتی ہوئی راہوں میں تادیر سرگرداں رہتا، سایوں سے تمثالیں بناتا، معنی کے سراب میں لفظ سراب بن کر اس کے آگے آگے چلتے۔

آفتاب اقبال شمیم اپنی نظموں میں لفظی و معنوی کیفیات، اجتماعی انفرادی زندگی کی داخلی و خارجی حوالوں سے تصویر کشی کرتے ہوئے عصری آگہی کے آئینے میں اپنے وجوی وژن کا اظہا کرتے ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم نے روایت کی تخلیقی انجذاب کو اہمیت دی ہے لیکن روایتی ہیتوں اور لفظیات کو خاص اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی تمام نظمیں تقریباً Run on Line کی تکنیک یعنی شعور کی رو، داخلی خود کلامی، مکالمہ، اساطیری علامتوں اور استعاروں اور عصری آگہی کی حامل مثالیں ہیں۔ نثری آہنگ ان کے منفرد اسلوب کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں زمان و مکاں کی قید میں تینوں زمانوں کو کھوجتے ہوئے ایک ایسے انسان کا تصور اجاگر ہوتا ہے جو ایک ہی وقت میں حال کی نارسائیوں سے آگاہ۔ ماضی کی کرب انگیزی کا گواہ ہونے کے باوجو امید افزا خواب فردا اپنی نگاہ میں رکھتا ہے۔

آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کا پہلا مجموعہ فردا نژاد کے نام سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ ان کے اس مجموعے میں مختصر نظمیں زیادہ ہیں۔ جو فکری سطح پر منفرد استعارہ سازی، تمثال پسندی اور دیو مالائی علامتوں کے ذریعے نظم کی دنیا کی تشکیل کرتی نظر آتی ہیں۔ ان نظموں میں شاعری کے عمومی مزاج سے ہٹ کر جذباتی انداز کو اعتدال میں رکھتے ہوئے آفتاب اقبال شمیم نے شعری تخیل کو پروان چڑھایا ہے۔ زید سے مکالمہ ان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ آٹھ طویل نظموں پر مشتمل ہے جسے آفتاب اقبال شمیم نے ظلم سہنے والوں کے عنوان سے رقم کیا ہے۔ اس مجموعے میں انھوں نے عصر حاضر کے تہذیبی اور ہماری نفسیاتی الجھنوں کی تصویر کشی کی ہے۔ زید فرد کی ذات کا استعارہ ہے جو داخلی اور خارجی صداؤں کی ترجمانی کرتا ہے کیونکہ دور جدید جدت پسندی

،سائنس و ٹیکنالوجی اور سامراجیت کا دور ہے۔انسان فنا اور بقا کی متصادم صورت حال میں خود کو تنہا کو محسوس کرنے لگا

-

آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کا تیسرا مجموعہ گم سمندر ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں طویل نظموں کی نسبت مختصر نظمیں زیادہ ہیں۔گم سمندر ایک مثالی انسانی معاشرے کی تصویر دکھاتا ہے۔انسانی کی نفسانی کیفیات کا ایسا بیان قاری کے سامنے آتا ہے جس سے آفتاب اقبال شمیم کے اسلوب میں ایک تغیراتی فضا نظر آتی ہے۔ان کی نظموں کا چوتھا مجموعہ میں نظم لکھتا ہوں ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں بھی شاعر کی عصر سے وابستگی منظم انداز میں انسان کی ترقی، معاشرتی ناہمواریوں اور تباہ کاریوں کے حوالوں کے ساتھ موجود ہے۔عہد حاضر میں جو نارواسلوک اور استحصال سامراجی حیلوں کی رہین ہو رہا ہے اس کی شدید مذمت اور ایک احتجاجی صدا سنائی دیتی ہے۔مغربی ممالک کی طرف سے کھیلا جانے والا انسانی جانوں کا کھیل، ماس پاپولر کلچر، ماس مارکیٹ اور صارفی کلچر کے ذریعے غریب ممالک پر اجارہ داری کے خلاف احتجاج اس مجموعے کا حسن ہے۔پانچواں مجموعہ ممنوعہ مسافتیں سعید احمد نے پہلی مرتبہ ۲۰۱۶ء میں نادر یافتہ میں شامل کیا ہے۔انھوں نے اس مجموعے کا انتساب غیر مشروط آزادی کے تمنا گزاروں کے نام کیا ہے۔

نظم شاعری کی ایک ایسی قسم ہے جو کسی ایک عنوان کے تحت یا کسی ایک موضوع پر لکھی جاتی ہے۔عصر حاضر کی جدید نظموں میں عصری حسیت کی مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔طارق ہاشمی آفتاب اقبال شمیم کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> آفتاب اقبال شمیم نئی نظم کے وہ نمائندہ شاعر نہیں، جن کے ہاں فرد کا تشخص اس کی آزادی سے مشروط ہے۔انسان صدیوں سے استبدادی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہے اور جبر کے خلاف اس کی یہ جنگ تاحال جاری ہے مگر اب تک انسان کو وہ آزادی میسر نہیں آئی جو اس کا بنیادی حق ہے۔[۱۲]

عصری حسیت سے مراد انسان کے فطرت کی طرف تجربات پر فطری رد عمل ہے۔جدید شاعری انسانی زندگی کا عکس پیش کرتی ہے۔جدید دور کا شاعر اپنی شاعری کی دنیا میں ہمارے سیاسی نظام، ہمارے نظریات اور معاشی نظام کا تجزیہ کرتا ہے۔عصری حسیت کا شاعر اپنے داخلی اور خارجی تجربات کو بیان کرتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے معاشرے میں پھیلے اضطراب، تنہائی اور کرب کا مشاہدہ کرتا ہے پھر وہ شاعری کے منظر نامے پر انسان کی جدوجہد، اس کی محنت اور اس کی بد قسمتی کی داستان بیان کرتا ہے۔جدید نظم کا شاعر باغی ہے اور وہ دنیا کے نام نہاد معاشی نظام کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔اس بغاوت کی ایک وجہ معاشی نظام کی ناانصافی ہے۔عہد حاضر کا غیر منصفانہ معاشی نظام مٹھی بھر افراد کو دولت کی کوٹھڑی کی چابی دیتا ہے کہ وہ دولت سے کھیلیں اور پر آسائش زندگی بسر کریں۔اس

کے برعکس لاکھوں کی تعداد میں مزدور اور کارکن دو وقت کی روٹی، لباس اور رہائش کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں۔

بیسویں صدی کو درست انداز میں سمجھنے کے لیے عصری حسیت مدد فراہم کرتی ہے۔ کسی بھی انسان کی حسیت سے مراد اس کا مثبت یا منفی طرز عمل ہے جو اسے اپنی زندگی کے عملی اور نظریاتی تجربات سے حاصل ہوا۔ وہ معاشرے میں بہت سے تجربات اور مشاہدات کرتا ہے اور اپنی منطق کے مطابق وہ ان تجربات اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حسیت کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے۔ کچھ وہ تخیلاتی تجربات سے بھی گزرتا ہے یا ایسے تجربات سے جن کا تعلق اس کی داخلی زندگی سے ہوتا ہے۔ کوئی بھی انسان جب اپنی عقل کے مطابق ان تجربات کو بیان کرے تو یہ اس کی حسیت ہو گی۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ حسیت کو ایک شاعر اپنے ذاتی تجربات یا احساسات تک محدود رکھے۔ حسیت کا مطلب اس کے گردونواح میں ہونے والے تجربات کو بیان کرنا بھی ہے۔ بیسویں صدی میں یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ حسیت سے مراد ایک شاعر کا مختلف تجربات، جذبات اور جمالیاتی قدروں کی طرف ایک رجحان ہے۔

آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کے موضوعات ایسے ہیں جو عصری حسیت کے مختلف عناصر کو اپنے اندر سموئے ہیں۔ ان کے شاعری کے مجموعے کی پہلی نظم "آدم زاد کی دعا" ہے جس کا موضوع عصر حاضر کے انسان کو درپیش مسائل ہیں۔ حاکم وقت نے انسان کے لیے زمین تنگ کر دی ہے جس کا شکوہ وہ تقدیر سے کرتے ہیں۔ بظاہر ایک ترقی یافتہ دنیا خوشحالی کی بلندی پر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں سائنس انسان کے لیے سہولیات پیدا کیں وہاں بہت سے مسائل بھی پیدا کیے۔ جدید انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اس کے عدم تحفظ کا احساس ہے۔ شاعر نے موجودہ انسان کے مصائب کے بیان کے لیے استفہامیہ لہجہ اختیار کیا ہے۔ وہ اپنے سوالوں سے ذریعے قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے اور انسان داخلی کشمکش میں مبتلا ہے۔ انسان اپنے گردونواح میں پھیلی بے حسی سے پریشان ہے کہ ہر طرف ظلم پر خاموشی ہے۔ جدیدیت کے چکر میں انسان مغربی ثقافت کی اندھا دھند تقلید کر رہا ہے۔ اس ثقافتی یلغار سے وہ اپنے آپ کو کسی مصنوعی انسان کی طرح محسوس کرتا ہے۔ بقول آفتاب اقبال شمیم:

جس کی ثقافت کے مچانوں سے
مجھے مارا گیا ہے اور میں شوکیس میں
لٹکا ہوا ہوں۔ [۱۳]

عصر حاضر کے انسانوں میں انسانیت کی اقدار دم توڑ گئی ہیں۔ سائنس کی ترقی نے انسان کو تنہائی کے کرب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسے ہر طرح کی سہولیت میسر ہیں پھر بھی وہ اپنی سانسوں کو گھٹتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ شاعر نظم کے آخری مصروں میں کاتب تقدیر سے مخاطب ہوتا ہے کہ میں اپنے انسان ہونے سے عاجز آ چکا ہے۔ لوگوں کے سرد رویے میری سانسوں میں چبھتے ہیں۔ شاعر خواہش کرتا ہے کہ اے پیدا کرنے والے مجھے کسی نئی شکل میں کسی نئے سانچے میں ڈھال دے۔ میں انسان بننا نہیں چاہتا کیونکہ میں اس دنیا کے رسم و رواج، طے شدہ قوانین و ضوابط اور بلاوجہ کی پابندیوں سے تنگ آ چکا ہوں۔ میں ایسی زندگی چاہتا ہوں کہ میری آزادی پر پہرے نہ بٹھائے جائیں، شرائط نہ عائد کی جائیں۔

خداوندا!
مجھے طائر، شجر، پربت بنادے
یا مجھے ڈھادے
کہ دوبارہ جنم لوں اپنی بے مشروط آزادی کی خواہش سے [۱۴]

مجموعی طور اس نظم میں شاعر نے ان تمام مسائل کا احاطہ کیا ہے جو عصر حاضر کے انسان کو ہر جگہ درپیش ہیں۔

نظم "زید آ" آفتاب اقبال شمیم کی کرداری نظم ہے جس میں وہ کردار سے مکالماتی انداز میں مخاطب ہیں ۔ شاعر مختلف حسیات کی منظر کشی کرتے ہیں۔ جدید دور کا انسان اپنی ذات کی لایعنیت کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ لایعنیت کا یہ رویہ جدید فلسفے کا ایک غالب ذہنی رویہ ہے۔ بقول آفتاب اقبال شمیم:

یلغار کرتی ہوئی ڈھونڈ لے گی ہمیں
ہم کہ آنکھوں کو اپنے ہی سایے سے ڈھانپے ہوئے
اور اپنے ہی پیچھے کھڑے
خود کو خود سے چھپانے میں مصروف ہیں [۱۵]

"تاچائے" چین کا ایک مثالی گاؤں ہے جسے چھن یونگ کوے نے ایک سو ساٹھ کسانوں کی قیادت کرتے ہوئے پہاڑوں کو پچھاڑ کر دوبارہ دریافت کیا۔ چین کے نائب وزیر اعظم جو ہر سال چار ماہ کے لیے اپنے آبائی گاؤں چلے جاتے تھے وہ تاچائے میں کسانوں کے ساتھ مل کر کھیتی باڑی کرتے تھے۔ آفتاب اقبال شمیم کی یہ نظم چینیوں کے عزم اور ہمت کی روداد بیان کرتی ہے۔ چینیوں نے اقتصادی اور معاشی ترقی کی منازل طے کرنے کے لیے انتھک محنت کی ۔ وہ سادہ غذا پر قناعت کرتے تھے کیونکہ چینی غریب ملک کے باشندے تھے۔ شہنشاہیت کے زیر اثر چینی دوسروں

کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے پھر انہیں یہ احساس ہوا کہ اپنی آزدای اور اقتصادی ترقی کے لیے انہیں دن رات محنت کرنا ہو گی۔ نظم سے حوالہ:

تختہ الٹا آمر کا
میناروں سے قد آور دہقانوں نے
آنکھوں کے، صبحوں کے پرچم کھولے ہیں
وقت اڑاتا پھرتا ہے
محنت کی خوشبوئیں دن کے معبد میں
کاہن ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ چھن یونگ کوائے، جس معبد کا [16]

نظم "نیم اجنیت کے پل پر ایک شام" میں جدید انسان کے معاشرتی مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ جدید شاعری کا ایک موضوع اجنبیت ہے۔ ارسطو انسان کو معاشرتی حیوان کہتا ہے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہنا پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے عزیز رشتے داروں اور دوستوں سے ملنا جلنا پسند کرتا ہے۔ جدید دور کے مسائل نے انسان کو تنہا کر دیا ہے۔ فکر معاش نے اس سے کی نیند اور اس کا سکون چھین لیا ہے۔ ہر انسان کو اپنی پڑی ہے۔ رشتے دار بھی بس نام کے رہ گئے ہیں کیونکہ عصر حاضر کا انسان اپنے مقاصد اور مطلب کے لیے رشتے بناتا ہے۔ رشتے داری نبھانے کے لیے اعلیٰ ظرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

یہ رشتے کیا ہیں
کیوں پتا شجر سے ٹوٹ جاتا ہے
یہ چاہت کی ہوس
جہد بقا کے سیپ میں پلتی ہے
یا کہ سچ کا موتی
مری آنکھیں کھلی ہیں لیکن اتنی کیوں نہیں کھلتیں
کہ ظرف لفظ میں جھانکوں [17]

"نارسیس" نظم میں آفتاب اقبال شمیم نے موجودہ سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی صورت حال کو پیش کیا ہے۔ نارسیس سے مراد نرگس ہے جس کے لغوی معنی نیند اور بے حس و حرکت یا سن ہونا بھی ہے۔ ہمارے ہاں جھیلوں اور تالابوں کی کمی ہیں ہے اور ان کے کنارے بیٹھ کر اپنا مکروہ چہرہ دیکھنے والے ان نارسیس نما ذہنی بیماروں کی بھی کمی

نہیں ہے۔ جو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے نئے بہانے تراشتے ہیں۔ انھوں نے عالمی سطح پر اور ملکی سطح پر استحصالی طبقے کو بے نقاب کیا ہے جو غریب لوگوں کا خون چوستے ہیں اور معاشرتی ناانصافی برتتے ہیں۔ جدید انسان اپنی ترقی کے باوجود اپنی شناخت کے بارے میں پریشان ہے۔ نظم سے حوالہ:

کسی کو ڈھونڈتا ہے
کونسی آواز ہے جس کا تعاقب کر رہا ہے
اور کیسی شام کے حلقے میں آکر
ڈوبتا جاتا ہے
کتنی دوریوں سے تک رہا ہے اپنے مشرق کو
مگر وسعت
نظر کی راہ دری سے اسے کیسے دکھائی دے
کسی لمحے کی آزادی
کبھی شاید اسے اپنے تشدد سے رہائی دے[۱۸]

"میں ابد ہوں" ایک طویل نظم ہے جس میں آفتاب اقبال شمیم اپنے ہم عصر دیگر شعرا کی طرح عصر حاضر کے کئی موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک موضوع مشرق کی غلامی ہے۔ مسلمان آج کل اسی دوہری غلامی میں مبتلا ہیں۔ کہیں دونوں قسم کی غلامیاں پوری طرح مسلط ہیں اور کہیں سیاسی غلامی کم اور ذہنی غلامی زیادہ ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت کوئی اسلامی آبادی ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں سیاسی اور ذہنی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہو۔ جہاں ان کو سیاسی استقلال اور خود اختیاری حاصل بھی ہے، وہاں وہ ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہیں۔ ان کے مدرسے، ان کے دفتر، ان کے بازار، ان کی انجمنیں، ان کے گھر، حتیٰ کہ ان کے جسم تک اپنی زبان حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ ان پر مغرب کی تہذیب، مغرب کے افکار، مغرب کے علوم و فنون حکمران ہیں۔ وہ مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں۔ مغرب کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مغرب کی بنائی ہوئی راہوں پر چلتے ہیں۔ خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو، بہر صورت یہ مفروضہ ان کے دماغوں پر مسلط ہے کہ حق وہ ہے جس کو مغرب حق سمجھتا ہے اور باطل وہ ہے جس کو مغرب نے باطل قرار دیا ہے۔ حق، صداقت، تہذیب، اخلاق، انسانیت، شائستگی، ہر ایک کا معیار ان کے نزدیک وہی ہے جو مغرب نے مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے دین و ایمان، اپنے افکار و تخیلات، اپنی تہذیب و شائستگی اپنے اخلاق و آداب، سب کو وہ اسی معیار پر جانچتے ہیں۔ جو چیز اس معیار پر پوری اترتی ہے اسے درست سمجھتے ہیں، مطمئن ہوتے ہیں، فخر

کرتے ہیں کہ ہماری فلاں چیز مغرب کے معیار پر پوری اتر آئی اور جو چیز اس معیار پر پوری نہیں اترتی اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر غلط مان لیتے ہیں۔ کوئی اعلانیہ اس کو ٹھکرا دیتا ہے، کوئی دل میں گھٹتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر اسے مغربی معیار کے مطابق کر دے۔ نظم کا حوالہ:

دھوپ کی پتیاں رستوں میں لٹاتی ہے ہوا
زرد مشرق میں غلامی کی سڑاند
صندلیں نسل کی یورش میں بہی جاتی ہیں
کیا یہ تہوار ہے خوشیوں کا؟ قہر کے کوہ سے بہہ نکلی ہے [19]

آفتاب اقبال شمیم اس نظم میں کئی تاریخی حوالے دیتے ہیں۔ منصور بن حلاج نے انا الحق کا نعرہ لگایا جس وجہ سے انہیں پھانسی چڑھا دیا گیا۔ منصور بن حلاج اپنے وقت کے ولی اللہ تھے۔ انھوں نے سر عام انا الحق کا نعرہ لگایا جس وجہ سے انہیں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ اگر عصر حاضر میں دیکھیں تو کبھی سچ بولنے والوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتار دیا جاتا۔ بقول آفتاب اقبال شمیم:

اور فرہاد نئے موسم کا
خودکشی کر کے انا الحق کی اذاں دیتا ہے [20]

ایک اور تاریخی حوالے سے آفتاب اقبال شمیم لکھتے ہیں کہ ویت نامی بھکشو ایک سامراجی نظام کے خلاف تھا جس نے احتجاج کے طور پر خود کو جلا ڈالا۔ جب وہ جل رہا تھا تو بڑے اطمینان کے ساتھ آلتی پالتی مارے، ہاتھ جوڑے بیٹھا تھا۔ وہ سامراجی نظام کے آگے جھکا نہیں اور نہ ہی موت سے خوف زدہ ہوا۔ نظم سے حوالہ:

ویت نامی بھکشو
کھول کر اپنی رگیں
خام قوت کے مقابل میں گواہی اپنی
دے رہا ہے دیکھو [21]

آفتاب اقبال شمیم نے اس نظم میں تاریخی حوالوں کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے انسان کی کیفیات بھی بیان کی ہیں۔ جدید انسان کا ایک بڑا خوف دہشت گردی کا خوف ہے۔ اس نظم میں انھوں نے عالمی سطح پر سامراجیت کے مناظر پیش کیے ہیں۔ اٹلی کے جزیرے سسلی کے اہم محل وقوع کے پیش نظر اکثر بڑی طاقتیں یہاں حملہ آور ہوتیں۔ اس لیے یہاں پہ مختلف شہروں کے لیے دفاعی قلعے تعمیر کیے گئے تھے۔ سامراجی قوتیں سب لوٹ کر لے گئی تھیں اس

وجہ سے ہر طرف بھوک کے سائے تھے۔ بارودی بموں کی بارش نے شہر کی خوبصورتی ختم کر دی۔ اس شہر کے قدرتی وسائل کو لوٹنے کے لیے سامراجی قوتیں بار بار اس پر حملے کرتی رہیں۔ آفتاب اقبال شمیم ان سامراجی طاقتوں کے لیے گورے وحشی کی ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ ان وحشیوں نے گولہ بارود سے شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔ اپنی سامراجی طاقتوں کے حملوں کی وجہ سے ہمیشہ بہت سارا نقصان بھی ہوا ہے۔ نظم سے حوالہ:

جو مرے مسخ شدہ چہرے کی
آخری سرخی ہیں
جبر کا سلسلے سسلی کے پہاڑ
پیٹ میں بھوک کے لاوے کا ابال
گھر پہ نیپام بموں کی بارش
اور گورے وحشی
سینکڑوں برسوں سے
ان گنت راستوں سے شہر پہ حملہ آور
اجنبی جبر کے خفیہ راستے
موت پھنکارتی پھرتی ہے گلی کوچوں میں [۲۲]

نظم "اے وطن" میں آفتاب اقبال شمیم پاکستان سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ وطن سے محبت کو موضوع ہر دور کی شاعری میں موجود رہا ہے۔ شاعر ابتدائی سطور میں اپنے وطن سے مخاطب ہے کہ وطن سے محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کو شاعر آزدانہ بیان کرنا چاہتا ہے۔ وطن سے محبت انسان کے خون میں شامل ہوتی ہے کیونکہ دھرتی کی مٹی انسان کی پرورش کرتی ہے۔ اس نظم میں آفتاب اقبال شمیم ملکی سطح پہ سیاسی، سماجی حالات اور جبر کے نظام کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ مقتدر طبقہ ملکی وسائل پر قابض ہے اور جن کے جابرانہ رویوں کے سبب ملک کا عام شہری دشواریوں کا سامنا کر رہا ہے اور مر مر کے جینے پر مجبور ہے۔ مفلسی میں زندگی گزار رہا ہے۔ بقول آفتاب اقبال شمیم:

اے وطن!
گونجتا ہے میرے خواب میں نغمہ ناشنیدہ ترا
میری ناداریوں پر
ترا منظر کھلتا نہیں

گنج بخشش پہ بیٹھے ہوئے اژدھوں کی شرر بار پھنکار سے
تیرے فرزند جھلسے ہوئے
تیری اولاد صدیوں سے اجڑی ہوئی
استقامت سے امید کے
رزق پر جی رہی ہے
کہ تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایک دن
پست و بالا کی تفریق سے ماورا
ایک سی روشنی۔۔۔۔۔۔۔ مثل خورشید۔۔۔۔۔۔ تقسیم کرتا نظر آئے گا [۲۳]

"گماں کا سایہ نورد" میں آفتاب اقبال شمیم عصر حاضر کو بیان کرتے ہیں کہ جدید معاشرے بے حس ہو چکے ہیں۔ ترقی نہ کرنے کی وجہ تحقیق کے جذبے کا فقدان ہے۔ ہمارا سارا علم محض معلومات ہیں یا محض دلیلوں پر مشتمل ہے۔ مادی ترقی تو معاشرے میں نظر آتی ہے مگر معاشرہ احساسات سے عاری ہوتا جا رہا ہے۔ ملک کا سارا انتظام ان جھوٹے سیاست دانوں کے قبضے میں ہے جو محض لوگوں کی تقدیر بدلنے کے دعوے کرتے ہیں۔

ہر طرف گولہ باری اور بارود کی بارش کے زمہ دار بھی یہ سیاست دان ہیں۔ لوگ ان حملوں میں مکھی مچھروں کی طرح مار دیے جاتے ہیں۔ معاشرہ طبقاتی تقسیم اور ناانصافیوں سے پر ہے جہاں جدید انسان بے بسی اور مقہوری کے عالم میں زندگی گزار رہا ہے۔ داخل اور باطن کی کشمکش میں مبتلا جدید معاشرے کا انسان سکون کی تلاش میں دربدر بھٹک رہا ہے۔ نظم سے حوالہ:

سب کچھ رئیس بلدیہ کی دسترس میں ہے
جسے دعویٰ ہے ایجادات سے اس ارض کی
قسمت بدلنے کا
مگر یہ اسلحہ و بارود، یہ غارت گری، یہ مال و دولت،
یہ شراکت کی دکانداری، یہ خالی پیٹ کی
کھائی میں گرتی خلقتیں، یہ تیسرے درجے
کے ڈبے سے اتری بے ٹکٹ عمریں،
یہ دہشت زار جس میں نامساوی جنگ جاری ہے [۲۴]

نظم "پیش اندیش" میں عصر حاضر کے موضوعات کی تصویر کشی ملتی ہے۔ عصر حاضر کے موضوعات میں جدید انسان کی مایوسی، انسانی رشتوں کی مادیت پرستی پر مبنی سوچ، غموں کے انبار اور بے یقینی کی کیفیت ہے۔ مایوسی کی ایک بڑی وجہ کسی خواہش کی زیادہ شدت ہے۔ جو خواہش جتنی زیادہ شدید ہو گی، اس کی تسکین اتنی ہی زیادہ خوشی کا باعث بنے گی، لیکن اگر یہ پوری نہ ہو تو انسان مایوس ہو جائے گا۔ رشتوں میں مادیت پرستی نے انسان کو روحانی زوال کی طرف دھکیل دیا ہے۔ آج کا ہر انسان مادیت کے ان رنگوں میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے کہ خود کو، اپنے اصل کو اور اپنے مقصد کو یکسر فراموش کر چکا ہے۔ اب لوگوں کی عزت وذلت، بلندی وپستی اور چھوٹے یا بڑے ہونے کی پیمائش شرف خودی کے پیمانے سے ہر گز نہیں ہوتی بلکہ کاروں، کوٹھیوں، بنگلوں اور بینک بیلنس کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ مادیت پرستی کے اس طوفان میں پہلے " ایمان ویقین" کا جنازہ اُٹھا، پھر "انسانی اخلاقیات" ہوا میں زرد پتوں کی طرح بکھر گئیں۔ اس مادیت پرستی کی وجہ سے لوگ صرف اپنے انہی رشتے داروں کی عزت کرتے ہیں جن کے پاس دھن دولت یا جبر کی قدرت ہے۔

کسی بھی ملک کی خراب اقتصادی حالت بے یقینی کی کیفیت کو جنم دیتی ہے۔ اس بے یقینی کی ایک اور وجہ عدم تحفظ کا احساس بھی ہے۔ اس بے یقینی کی کیفیت سے لوگوں میں اضطراب اور بے چینی کی کیفیات پیدا ہونے لگتی ہیں جس سے لوگ داخلی کشمکش کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نظم سے حوالہ:

ارادے نیم سنجیدہ ہیں، رشتے خام ہیں،
مطلب کی دنیا، ایک ایڑھی پر مسلسل گھومتی دنیا
نظر آتی ہے لامرکز توازن میں
میاں کا ٹھاٹھ، اودھار قص، بسم اللہ کی شہنائی
تمنازاد! سمجھو بھی
یقیں میں بے یقینی، بے یقینی میں یقیں کی
اس مسافت میں
ہمیں امکاں کی خوش فہمیوں کے ساتھ
جینا ہے [۲۵]

نظم "دوراہے پر" میں آفتاب اقبال شمیم جدید ٹیکنالوجی سے بننے والے ہتھیاروں پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں کہ جدید ہتھیاروں نے انسانیت کو تباہی و بربادی کے دوارہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ ایٹمی ہتھیار اتنے مہلک ہیں کہ چند

سیکنڈز میں شہروں کے شہر خاک میں ملادیتے ہیں۔انسانی جانوں کے لئے دہشت کی علامت اور مہلک ترین ہونے کے باوجود، ایٹمی طاقتیں نہ صرف اپنے ان ہتھیاروں کو تلف کرنے کا ارادہ نہیں رکھتیں بلکہ وہ اس کی شدت میں اضافہ کرکے ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

جوہری ہتھیاروں سے لیس ممالک اپنے اسلحے کو جدید سے جدید ترین بنانے میں مصروف ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام ایٹمی ممالک اپنے ایٹمی اسلحہ میں تخفیف کریں اور اپنے وسائل اور صلاحیتوں کو سامان جنگ وجدل کی بجائے عالمی امن اور اقوام عالم سے غربت و مہنگائی کے خاتمے کے لئے بروئے کار لائیں تاکہ یہ دنیا ہر ایک انسان کے لئے امن، سکون اور خوشیوں کا باعث ہو۔

جدید ایٹمی ہتھیاروں سے لیس مغرب کی سامراجی طاقتیں پوری دنیا پر غلبے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔تیسری دنیا کے ممالک اس دوڑ کی زد میں ہیں کیونکہ جدید ٹیکنالوجی اور جدید ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال سے ہی وہ ان ممالک پر قبضہ کرسکتی ہیں۔تیسری دنیا کا ہر فرد اس دوڑ سے خوف وہراس میں مبتلا ہے کیونکہ مغربی ممالک کی غلامی سے ان کی شناخت محض غلاموں کی رہ جائے گی۔مغربی طاقتیں تیسری دنیا کے انسانوں کو ناکارہ چیزوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتیں۔بقول آفتاب اقبال شمیم:

فنا کے تیر جو رکھتا ہے ایجادوں کے ترکش میں
جو اپنے ناخن آتش سے
چہرہ مسخ کرسکتا ہے دنیا کا
سکندر۔۔۔اسلحہ خانے کا مالک
اپنی مفتوحہ زمینوں کے مکینوں سے
تقاضا کررہا ہے
فرد سے نافرد ہونے کا
تقاضا کررہا ہے زید سے
پہچان کھونے کا
وہ کہتا ہے۔میرے نزدیک
تم بازار کی ایک جنس، اک ڈسپوزایبل کے سوا
کیا ہو! [۲۶]

"کیا ہیں میرے اسرار" نظم میں آفتاب اقبال شمیم نے عصر حاضر کے مختلف موضوعات کو بیان کیا ہے۔ جدید انسان روحانی کرب میں مبتلا ہے جو اسے ہر لمحہ اذیت دیتا ہے۔ ہم مصنوعی زندگی اور عیش و عشرت کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں۔ کہ سادہ اور فطری زندگی گزارنا دشوار ہو گیا ہے۔ زندگی کو زندگی کے بناوٹی مطالبات نے الجھا کر رکھ دیا ہے۔ لوگ ہر وقت خواہش نفس کی تسکین کے لیے پریشان اور پراگندہ رہتے ہیں۔ لیکن حقیقی سکون اور اطمینان قلب میسر نہیں آتا۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر مشکلات اور مصائب نہ ہوتے تو شاید انسان سوچنا چھوڑ دیتا۔

جدید انسان آزاد ہونے کے باوجود آزاد نہیں ہے۔ زمان و مکاں کا اسیر ہے ہر لمحہ آزادی کے خواب دیکھتا ہے ۔ فکر معاش وہ بد بلا ہے جس نے دنیا کے تقریباً ہر انسان کو قابو کیا ہوا ہے۔ صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی، یا یوں کہیں کہ رات سونے سے قبل اگلے دن آمدنی کے حصول کے طریقے، منصوبے اور کمائی کی فکر سر پر سوار کر کے انسان فکر مندی کی نیند سو جاتا ہے اور صبح اٹھتے ہی فکر معاش میں مبتلاء ہو جاتا ہے۔ یہ طرز زندگی شاید ہر اس انسان کی ہے جس کے پاس آمدنی کے محدود ذرائع ہوں۔ ممکنہ طور پر یہی وجہ ہے کہ مفلسی میں پنپتے معاشرے کا کوئی، فرد اپنی آمدنی پر ناخوش نظر آتا ہے، کوئی شخص حکومتی پالیسی کو ہدف تنقید بناتا نظر آتا ہے۔ نظم سے حوالہ:

میں اپنی خطا کار
اپنے ہی محاذوں پہ رہی مجھ سے میری جنگ!
میں سادہ منش جان نہ پایا کہ زمیں
اور زماں اور زمانے کی مثلث سے نکلنے کی
بجز مرگ کوئی راہ نہیں
آدمی چاہے کہ نہ چاہے
ہے اسی قید میں جینے کا سزاوار
میں صاحب یک خواب
کرتا ہوں اندھیرے میں اجالے کا سفر
اجالے میں اندھیرے کا سفر [۲۷]

نظم "میں کون ہوں!" کا موضوع جدید انسان ہے جو اپنی شناخت کے بارے میں پریشان ہے۔ نظم "میں کون ہوں!" مغرب کے سابقہ سامراجی نظام کا ایک کردار جو اپنی آنکھوں سے غلامی دیکھ چکا ہے اپنی شناخت چاہتا ہے ۔ وہ سامراجی نظام کی تباہ کاریوں کا عینی شاہد ہے۔ اس نے شہروں کو مسمار ہوتے دیکھا ہے۔ انسانوں کو جانوروں کی

طرح انسانوں کی غلامی کرتے دیکھا ہے۔ یہ سب اس کے شعور اور لاشعور کی دنیا میں محفوظ ہے کیونکہ وہ اس غلامی سے نجات حاصل نہیں کر سکا۔

ان سب حالات کے باوجود تیسری دنیا کا انسان مایوس نہیں ہے۔ اسے امید ہے کہ کبھی ہماری یہ ذہنی غلامی ختم ہو جائے گی۔ اس کی یہ امید اس وقت دم توڑنے لگتی ہے جب وہ اپنے سامنے سامراجی طاقتوں کے نئے منصوبے پایہ تکمیل تک پہنچتے دیکھتا ہے۔ پھر اسے غلامی سے نجات ایک واہمہ محسوس ہوتا ہے۔ نظم سے حوالہ:

میں لڑکپن میں اس جنگ کی ہولناکی سے گزرا ہوں
جس کی گزرگاہ کا آخری شہر
اپنی ہی مٹی کے اٹھتے الاؤ کے مشروم میں
دیکھتے دیکھتے بے نشاں ہو گیا
اپنی شمشان کی راکھ میں سو گیا
بے ثباتی کی تاریخ کے منظروں سے مگر
آنکھ مانوس ہوتی ہیں
واہمہ ایک نیا واہمی [۲۸]

نظم "کیسی مایوسیاں" میں آفتاب اقبال شمیم عصر حاضر کے انسان سے مخاطب ہیں۔ وہ اسے کہتے ہیں کہ اپنے من کی دنیا سے باہر جھانک۔ اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر۔ انسان اشرف المخلوقات ہے جو اپنی ذہانت اور محنت سے اس کائنات کو تسخیر کر سکتا ہے۔ انسان پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ اسے ایسی صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے مگر ایک حد تک۔ عصر حاضر کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ خام اندیشیوں میں ڈوبا رہتا ہے۔ اسے اپنی صلاحیتوں پہ یقین نہیں ہے۔ انکار و اقرار کی یہ بے یقینی اسے ہار ماننے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔ اگر وہ استقامت سے اپنے فیصلوں پر ڈٹا رہے اور محنت کرتا رہے تو یہ زمین اس کے لیے سونا اگل سکتی ہے۔ آفتاب اقبال شمیم اس حوالے سے کہتے ہیں:

جسم سے روح تک ایک مکان کی
بے شماری کے در تجھ پہ کھلتے رہے
تو مگر اپنے ڈر،
خام اندیشیوں میں رہا

سچ یہی ہے کہ تو اپنے انکار و اقرار کی
بے یقینی میں ہے
ہار تیرا مقدر نہیں [۲۹]

آفتاب اقبال شمیم نئی شعری جہتوں کے حامل شاعر ہیں۔ان کی نظمیں فلسفیانہ اور فکری نوعیت کی ہیں۔ان کے تجربوں کا میدان بہت وسیع ہے۔ان کی نظموں میں عصری حسیت کے موضوعات کی بھرمار ہے۔ان کی نظموں کے موضوعات میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر سامراجیت، جدید انسان کے مصائب، اقتصادی صورت حال، معاشی صورت حال، معاشرتی صورت حال غرضیکہ موضوعات ایک وسیع کینوس ہے جس پر انھوں اپنے شاعرانہ تخیل سے اعلیٰ نظمیں تخلیق کی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ خواجہ محمد اکرام الدین ،اردو کی شعری اصناف،(دہلی: شعبہ اردو، ندارد)، ص،۴۸۔

۲۔ ارشد محمود ناشاد،اصناف ادب :تفہیم و تعبیر (منتخب تنقیدی اقتباسات) (مرتب)، (اسلام آباد: گل اعوان پرنٹرز،۲۰۱۶ء)، ص۶۹۔۷۰۔

۳۔ ندیم احمد،ترقی پسند ،جدیدیت ،ما بعد جدیدیت(مرتب)،(دہلی: بھارت آفسیٹ، ۲۰۰۲ء)، ص،۱۹۷۔

۴۔ امجد علی شاکر،اردو ادب تاریخ و تنقید،(لاہور: عزیز پبلیشرز،۱۹۹۲ء)، ص،۴۹۷۔

۵۔ مظفر ایوبی،اردو شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش،(پاکستان: انجمن ترقی اردو،۲۰۱۰ء)، ص،۱۲۰۔

۶۔ احتشام علی ،جدید اردو نظم میں عصری حسیت،(لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء)، ص۲۰۔

۷۔ انور جمال،ادبی اصطلاحات،(اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۵ء)، ص،۹۵۔

۸۔ احتشام علی،جدید اردو نظم میں عصری حسیت،(لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء)، ص۲۱۔

۹۔ وزیر آغا،تنقید اور جدید اردو تنقید،(کراچی: مطبع احمد گرافکس،۱۹۸۹ء)، ص،۱۶۶۔

۱۰۔ منظر اعظمی،اردو میں شعری زبان کی اصلاحی کوششیں،(دہلی۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۸۸ء)، ص۱۹۵۔

۱۱۔ احتشام علی،جدید اردو نظم میں عصری حسیت،(لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء)۔

۱۲۔ طارق ہاشمی،اردو نظم اور معاصر انسان،(اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۱۵ء)، ص۱۸۲۔

۱۳۔ آفتاب اقبال شمیم۔نادر یافتہ : کلیات،سعید احمد(مرتب)،(اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۶ء)، ص۲۶۔

۱۴۔ ایضاً، ص۲۶۔

۱۵۔ ایضاً، ص۷۳۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۹۲۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۰۹۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۳۴۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۰۵۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۰۵۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۰۶۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۱۵۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۸۷۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۵۷۳۔

۲۵۔ ایضاً ص ۸۵۳۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۶۲۷۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۶۲۹۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۸۳۹۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۹۱۰۔

باب دوم:

آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں

سامراجیت اور ردِ سامراجیت

باب دوم:

آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں سامراجیت اور ردِ سامراجیت

عصر حاضر کے منظر نامے پر بظاہر نو آبادیاتی نظام نظر نہیں آتا مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ نو آبادیاتی نظام ختم نہیں ہوا صرف آقاؤں کی دنیا کا عنوان بدلا ہے۔ عہد حاضر میں تیسری دنیا کے غلاموں کی ڈور امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے ہاتھ میں ہے۔ امریکہ اور اس کے اتحادی یورپی ممالک تیسری دنیا میں انسانوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح مار رہے ہیں۔ افغانستان اور عراق میں خانہ جنگی کی صورت حال ہے۔ افغانستان اور عراق میں امریکہ کے تسلط کا مقصد ان کے قدرتی وسائل کو لوٹنا ہے۔ تیسری دنیا اب بھی امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے لیے غلاموں کی دنیا ہے۔

نو آبادیاتی نظام کی بنیاد نو آبادیاتی باشندوں کے استحصال پر رکھی جاتی ہے۔ نو آبادکار "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے اصول کے تحت حکمرانی کرتے ہیں۔ نو آبادیوں کا قیام ایک منصوبے کے تحت عمل میں آیا۔ اس نظام کے قیام کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کی گئیں۔ کہیں تو یورپی اقوام نے عسکری طاقت کا بھیانک استعمال کیا اور کہیں بڑے پیمانے پر نسل کشی کی۔ نو آبادیات کسی ملک کے سماج پر بے جا قبضے اور اجارے سے عبارت ہے۔ یہ اجارہ مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے جیسے زبان پر اجارہ، تعلیمی نظام پر، سیاست پر، معیشت پر، مذہب پر، تہذیب و ثقافت پر، ذہن پر، نفسیات پر اور ادب پر۔ نو آبادیات کو سامراجیت کی ایک شکل قرار دیا جاتا ہے۔ طاقت ور ممالک کمزور ممالک پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے اپنا سیاسی اور معاشی اثر و رسوخ استعمال کرنے کے لیے ایک نظام یا طریقہ کار وضع کرتے ہیں۔ اسے سامراجیت (Imperialism) کا نام دیا جاتا ہے۔ ثقافت اور سامراج (*Culture and Imperialism*) میں ایڈورڈ سعید نے یورپ، ہندوستان، الجیریا اور افریقہ کی ادبی تحریروں کا تجزیہ کیا ہے اور نو آبادیوں میں بالخصوص ہندوستان اور الجیریا کے ثقافتی رجحانات کا مطالعہ کیا ہے۔ یورپی تحریروں میں افریقہ اور ہندوستان کے بارے میں بیانیے محض نو آبادیاتی غلبہ قائم کرنے کی یورپی کاوش کا حصہ تھے۔ ان بیانیوں میں پراسرار مشرق کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کا اظہار ملتا ہے۔ جن کے مطابق افریقی، ہندوستانی، آئرش، جمیکائی یا چینی ذہن دقیانوسی ہیں، ان وحشی اقوام کو تہذیب یافتہ کرنے کی ضرورت ہے، ان کے برے رویے اور بغاوت کی سزا موت ہے، ان کی اصلاح تشدد اور طاقت کے استعمال سے ممکن ہے۔ وہ ہمارے جیسے انسان نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان پر حکومت کی جائے۔

ثقافت اور سامراج میں ایڈورڈ سعید کا ثقافت کے بارے میں کہنا ہے:

> تمام ثقافتوں میں غیر ملکی ثقافتوں کی نمائندگی کا رجحان موجود ہوتا ہے اور ان میں کسی نہ کسی حد تک یہ اہلیت موجود ہوتی ہے کہ وہ ان غیر ملکی ثقافتوں پر اختیار حاصل کر سکیں۔ تاہم سبھی ثقافتیں غیر ملکی ثقافتوں کی نمائندگی یا ان پر اختیار حاصل نہیں کر سکتیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ جدید مغربی ثقافتوں کا ہی طرہ امتیاز ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مغربی علم اور غیر یورپی دنیا کے بارے میں ان کے بیانات کا مطالعہ کیا جائے۔[1]

اردو لغت کے مطابق سامرج:

> وہ نظام حکومت جو نو آبادیات پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے قائم کیا جائے، ملوکیت کا نظام، شہنشاہیت کی حاکمیت۔[2]

عالمی سامراج نے دنیا کے انسانوں کو تقسیم کر کے رنگ و نسل اور مذہب، فرقہ اور زبان و لسان کی بنیاد پر سرحدیں قائم کر دی ہیں۔ عالمی سامراج کا گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ عالمی سامراج جس طرح ویت نام، زمبابوے، کوریا، جنوبی افریقہ جیسے ممالک پر حملہ آور ہوتا تھا۔ اب وہ اپنے رخ بدل رہا ہے۔ کریمیا کے مسئلے پر بھاگ کھڑا ہوا۔ شام سے دستبردار ہونا پڑا۔ یمن میں بھی شکست سے دوچار ہوا۔ افغانستان اور عراق سے بھی بھاگنے کا راستہ تلاش کر رہا ہے۔

اس صورت حال میں امریکی سامراج کی لبنان میں مختلف کمیونٹی میں تضادات پھیلا کر آپس میں انتشار پھیلانے کی کوششوں کو لبنانی صدر حریری نے ناکام بنا دیا۔ اسرائیلی حکومت نے بیت المقدس کے مشرقی حصے میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں بجلی، سیوریج اور پانی کی مصنوعی قلت پیدا کر دی جو فلسطینیوں کی نسل کشی کے مترادف تھی۔ امریکہ بار بار کوریا کو حملے کی دھمکیاں دیتا رہا جس سے امریکہ کو منہ کی کھانی پڑی۔ امریکیوں نے بیت المقدس کو موضوع بنا کر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے مابین فساد کو جنم دیا۔ ایک تو پہلے ہی مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی اپنے عروج پر ہے۔ اس جلتی آگ پر امریکہ تیل چھڑکتا رہتا ہے۔ اسی طرح امریکہ اپنی اسلحہ ساز کمپنیوں کے ذریعے پیسے کما سکتا ہے۔ امریکہ کی صنعتی پیداوار کا ستر فیصد اسلحے کی فروخت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس اسلحے کی خرید و فروخت سے امریکی معیشت کو تقویت ملتی ہے۔ اسرائیل اپنی جارحانہ کاروائیوں فلسطینیوں کی نسل کشی کر رہا ہے اور بیت المقدس کے مغربی حصے میں یہودیوں کی نئی بستیاں آباد کر رہا ہے۔

پہلی اور دوسری عالمی جنگ میں ایک جانب کروڑوں انسانوں کی جان جاتی رہی تو دوسری جانب اسلحہ سازوں کے منافع میں زبردست اضافہ بھی ہوا۔اب امریکی سامراج کا ویتنام، کوریا، لاؤس، کمبوڈیا، افریقہ، چلی اور دنیا بھر میں اسلحے کی فروخت کا سلسلہ بند ہو کر افغانستان، عراق، شام لبنان، لیبیا، مصر اور یمن میں منتقل ہوا۔اب عراق، شام اور لبنان سے انتہاپسندوں کا تقریباً خاتمہ ہوا ہے۔در حقیقت عالمی سامراج پسماندہ ملکوں کے قدرتی وسائل اور پیداوار پر قبضہ جمانے اور وہاں کی دولت کو لوٹنے کے لیے عوام کو رنگ و نسل، مذاہب اور فرقوں میں بانٹ کر لڑواتا ہے۔ان جھگڑوں میں فتح حاصل کرنے کے لیے فریقین کو اسلحے کی ضرورت ہوتی ہے اور اسلحہ کی پیداوار سب سے زیادہ امریکا میں ہوتی ہے۔اس اسلحے کے عوض امریکی سامراج اور دیگر عالمی سامراج پسماندہ ملکوں سے معدنیات، تیل، گیس اور دیگر قدرتی وسائل کوڑیوں کے بھاؤ خرید کر لے جاتا ہے۔تیل اور گیس پسماندہ ملکوں کی بڑی پیداوار ہیں۔سعودی عرب، ایران، افغانستان، عرب امارات، برما، عراق، لیبیا وغیرہ میں گیس اور تیل پیدا ہوتا ہے اور ان پر امریکا، چین اور فرانس قابض ہیں۔جب ان کے مفادات ٹکراتے ہیں تو یہ انہیں آپس میں لڑواتے ہیں، سستے داموں میں قدرتی وسائل خریدتے ہیں اور مہنگے داموں میں اسلحہ بیچتے ہیں۔ان تمام مسائل کا حل سامراجی تسلط سے آزادی اور دنیا کے مقہوروں کو ایک کرنے میں مضمر ہے۔

عالمی سامراج نے دنیا کے انسانوں کو تقسیم کر کے رنگ و نسل اور مذہب، فرقہ اور زبان و لسان کی بنیاد پر سرحدیں قائم کر دی ہیں۔دنیا ایک تھی، کوئی طبقہ تھا اور نہ کوئی ریاست۔صاحب جائیداد طبقات نے دنیا کو تقسیم کیا۔کچھ لوگوں کو برہمن، سردار، وڈیرہ، ارب پتی اور کھرب پتی بنا دیا اور بیشتر لوگوں کو مزدور، کسان، دھوبی، گاڑی بان، نائی، چمار، موچی، کمی، ہاری، مسلی، بھنگی بنا دیا۔اسی بنیاد پر دولت مندوں کو عقل مند اور استحصال زدہ لوگوں کو کم عقل اور پنچ قرار دیا۔غیر طبقاتی سماج پچاس ہزار برس پر مشتمل تھا، جب کہ طبقاتی سماج چھ ہزار سال پر مشتمل ہے۔

امریکا اور اسرائیل میں لاکھوں کروڑوں لوگ بے روزگار ہیں اور دوسری طرف امریکا کے ۶۸ بحری بیڑے دنیا کے سات سمندروں میں لنگر انداز ہیں۔مشرق وسطیٰ میں سب سے زیادہ امریکی فوج اسرائیل میں ہے اور دوسرے نمبر پر سعودی عرب میں۔اس لیے دنیا کی تمام پیداواری قوتیں، شہری اور محنت کش عوام صاحب جائیداد طبقات سے جائیداد چھین لیں گے، پھر کوئی طبقہ ہو گا اور نہ کوئی ریاست۔اس لیے کہ ریاست بنیادی طور پر

جبر کا ادارہ ہے۔ وکٹر ہیوگو نے کہا تھا کہ جب جائیداد، ملکیت، خاندان، فوج، پولیس، عدالت، میڈیا اور ریاست کا خاتمہ ہوگا تب لوگ جینے لگیں گے۔

جدید مغربی سامراج کے اس متضاد، جابرانہ، آمرانہ اور استحصالی طرز عمل کے پہلو بہ پہلو اسی مغرب میں تعلیم و تربیت پانے والے ایسے غیر مسلم دانشور بھی پائے جاتے ہیں جو اس نئی سامراجیت کو آئینہ دکھانے میں کوئی شرم اور ندامت محسوس نہیں کرتے۔ دوسری جانب بہت سے مسلم ممالک کے سربراہان امریکہ کے جدید سامراجی اقدامات کی حمایت بلکہ امریکی سامراج کے جرائم کی ذمہ داری اپنے سر لینے کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ با جوڑ میں ۸۲ معصوم اور کم عمر طالبان علم کے سفاکانہ انداز میں شہید کیے جانے کو اپنے سر لینا جب کہ وہاں کے عینی شاہدوں کے بیان کے مطابق امریکی جنگی ہوائی جہازوں نے اس جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ شکست خوردہ ذہنیت اور طاغوت کے سامنے سر بسجود ہونے کا ایک واضح ثبوت کہا جا سکتا ہے۔ یہ بے ضمیر افراد طاغوت کے سامنے سجدہ ریز ہونے کو اپنی معراج تصور کرتے ہیں اور دوسری جانب ایسے امریکی غیر مسلم دانشور ہیں، جو امریکہ کی سامراجیت کو امن عالم کے لیے ایک مہلک خطرہ قرار دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد اپنے ایک تنقیدی مضمون "امریکی سامراجیت اور مسلمان" میں امریکہ کے جبری رویوں پر لکھتے ہیں:

> آج جب امریکی سامراج کے بعض نمک خوار دوسروں کے جرائم کو اپنے سر لے کر وفاداری ثابت کرنے کے درپے ہیں، یونیورسٹی آف ایریزونا کے پروفیسر Richard M. Eaton کا مضمون جو ۳ اکتوبر ۲۰۰۲ کے London Review of Books میں طبع ہوا ہے، عراق پر امریکی جارحیت کے پس منظر کو واقعاتی دلائل کی مدد سے امریکی حکومت کے ذمہ دار افراد کے اسماء گرامی کے ساتھ ہمیں بتاتا ہے کہ بش کی کابینہ کے افراد اور بعض فکری اداروں سے وابستہ ماہرین نے کس طرح اپنے ہاتھ تاپنے کے لیے عراق میں آگ بھڑکائی۔ "وہ نئی امریکی صدی" کے منصوبے کے مصنفین اور کرداروں کی نام بنام نشاندہی کرنے کے بعد امریکہ اور اسرائیل کی ساز باز اور عراق پر حملے کے محرکات وغیرہ پر کھل کر بحث کرتا ہے اور واضح الفاظ میں مشرق وسطیٰ میں امریکہ کی خواہش کے مطابق نئے نقشے کے مطابق ممالک کی بندر بانٹ پر روشنی ڈالتا ہے۔[۳]

ہم کچھ سمجھیں نہ سمجھیں لیکن اتنا ضرور جان لینا ہے کہ سامراجیت کا شکار وہ ممالک ہوا کرتے ہیں جہاں جہالت اور قدامت کا راج ہو،اسلاف پرستی اور مذہبی انتہا پسندی عروج پر ہو،لوگ بین الاقوامی حالاتِ حاضرہ سے لاتعلق ہو کر معمولی اور گھٹیا نوعیت کی گُتھیاں سلجھانے میں الجھے ہوں، اجتماعیت کے بجائے انفرادیت کا راج ہو، قومی زندگی کے رگ و ریشے میں کرپشن کا زہر لہو کی طرح گردش کرے،حکمران اپنے قومی اختیارات کا استعمال ذاتی مقاصد کے حصول کے لئے کریں، میرٹ نام کی کوئی شے کہیں دکھائی نہ دے،تجدید اور ایجاد کی راہیں مسدود کر دی جائیں،سائنس و ٹیکنالوجی کا پیڑ اپنی جڑوں تک سوکھ جائے،عوام کو بالعموم اور اشرافیہ کو بالخصوص وہ کھانے اور پہننے کی عادت پڑ جائے جو اپنے کھیتوں میں اُگتا ہو نہ اپنے کارخانوں میں بنتا ہو۔کیا یہی سب کچھ پاکستان میں بھی نہیں ہو رہا؟ شاید آپ نہیں جانتے کہ ہم کس تباہی و بربادی کے کتنے قریب پہنچ چکے ہیں۔

آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں سامراجیت کے عناصر کا تجزیہ احتشام علی کی کتاب جدید اردو نظم میں عصری حسیت سے اخذ کردہ خاکے کی روشنی میں کیا گیا ہے جو باب اول میں دیا گیا ہے۔

آفتاب اقبال شمیم نے اپنی نظموں میں عصری حسیت کے تناظر میں بین الاقوامی منظر نامے پر سامراجیت سے ہونے والے ظلم وجبر،استحصال اور تشدد پر فکر انگریز نظمی بیانیہ تشکیل دیا ہے۔ان کی نظم "بے زور آور" میں سامراجی بیانیے کی تشکیل کی ہے۔وہ غریب ممالک پر مغربی ممالک کی طرف سے ہونے والی اشتعال انگیز گولہ باری کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ان کی گولہ باری سے معصوم نہتے شہریوں کی رہائش گاہیں تباہ ہو جاتی ہیں۔لوگ بے گھر ہو جاتے ہیں ۔گولوں کی آوازوں سے پورے علاقی کی دیواریں لرز اٹھتی ہیں۔لوگ اس گولہ باری کے خوف سے نئی پناہ گاہیں تلاش کرنے لگتے ہیں۔بے چارے معصوم شہری ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹتے ہیں۔لوگ سوچتے ہیں کہ یہ ہمارے غم کب ختم ہوں گے ؟ہماری یہ سزائیں کب کٹیں گی ؟یہ ناآسودہ حالی کب ختم ہو گی ؟لوگ دن اور رات کے وقت اپنے گھروں میں قید ہو جاتے ہیں اور بے گناہ قیدیوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ شاعر کے مطابق سامراجی طاقتیں دوسرے ممالک پر ناجائز قبضے کو اپنا حق سمجھتی ہیں۔دوسری طرف غریب اور پسماندہ ممالک اس قبضے کے لیے سازگار حالات فراہم کرتے ہیں۔سامراجی طاقتوں کی طرف سے عائد کردہ شرائط پر زندگی گزارنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ان کی طرف سے دی گئی امداد ہمارے لیے زہر ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری بقا ہے۔بقول آفتاب اقبال شمیم:

بے الزام قیدیں کاٹنا ہے
اور کہتا ہے
سزا کا زہر امرت ہے
یہاں اپنی سرحدوں کے ملک میں بھی دوسروں کا دخل
برحق ہے
یہاں جینے کی یہ مشروط آزادی ہمارا خود نوشہ حکم نامہ ہے[۴]

آفتاب اقبال شمیم جہاں مغربی سامراج پر طنز کرتے ہیں وہاں وہ تیسری دنیا کے ممالک کو بھی تنقید کی زد میں لاتے ہیں۔ان کے خیال میں اگر غریب اور پسماندہ ممالک خود کفیل ہوں، انہیں امداد کی بھیک نہ مانگنی پڑے اور انہیں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے بار بار اپنا کشکول ان کے سامنے نہ کرنا پڑے تو یہ سامراجی طاقتیں کبھی بھی غریب ممالک کا استحصال نہ کریں۔ آفتاب اقبال شمیم ایسی بھیانک صورت حال میں بھی پر امید ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ غریب ممالک کے باشندوں میں کچھ ایسی خامیاں ہیں جن کا مداوا ضروری ہے۔ان کے اندر غور و فکر کی صلاحیتیں دم توڑ گئی ہیں ۔غلامی نے ان کے جذبوں کو سرد کر دیا ہے۔وقت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ممالک سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں ترقی کریں۔اپنی پستیوں کے اندھیروں سے نکلیں اور ترقی کی روشنی کی طرف رخ بسفر ہوں۔اپنے اسلاف اور آباؤ اجداد کے کارناموں کو دیکھیں کہ کیسے انھوں نے کیسے کیسے کارنامے سرانجام دیے۔شاعر ان سوئی ہوئی قوموں کے ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے کہ وہ کمتر نہیں بلکہ وہ اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ان کا تعلق بہادر قوموں سے ہے۔وہ اس گولہ باری سے ہونے والے ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے عہد کرتے ہیں کہ وہ جیں گے۔ نظم سے حوالہ:

جینے کے تدبر اور جذبے کا تقاضا ہے
کہ ہم اپنے نشیبوں سے بلندی کی طرف دیکھیں
جہاں کے اوج سے فتحیں
تمنا کی زباں میں ہم سے کہتی ہیں
ہم بونے نہیں ہیں دیوتا ہیں
جو نئی ساعت کی کالی ریل کے نیچے کٹے اعضاء کو جمع کر کے
دوبارہ جنم لیتے ہیں۔۔۔۔۔۔
اس نوروز پر جینے کا پھر سے عہد کرتے ہیں [۵]

آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم "گرتے ستون کا منظر" میں پاکستان کی تاریخ کے ایک اہم سیاسی واقعے کے منظر نامے کو پیش کرتے ہیں۔ یہ واقعہ ہماری تاریخ ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ ہماری تاریخ کے ایک سیاہ دن میں ایک انقلابی اور عظیم ہستی کو تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ تاریخ آج بھی اس سانحے پر نوحہ کناں ہیں۔ کئی عالمی سربراہاں نے نے جنرل ضیاء الحق سے درخواست کی کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں اور اس عظیم رہنما کو ملک بدر کر دیں۔ اس نظم میں آفتاب اقبال شمیم نے اس جادوئی شخصیت رکھنے والے اس عظیم لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی پر اپنے کلام کو اس جبر کے خلاف بطور ہتھیار پیش کیا۔ شعرا اور باشعور طبقے نے اس سفاکانہ واقعے کو شاعری کی زبان میں رقم کیا۔ شاعر ذوالفقار علی بھٹو کو پاکستانی سیاست کا ایک اہم ستون سمجھتے ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے مختصر سیاسی عہد میں عالمی سطح پر پاکستان کا وقار بلند کیا۔ انھوں نے غریب اور مزدور طبقے کی فلاح و بہبود کے لیے کئی منصوبے تشکیل دیے۔ بھٹو کے دور میں ہونے والی اصلاحات میں بھاری صنعتوں کو قومی تحویل میں لینا، بنکوں، انشورنس کمپنیوں اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لے کر انہیں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے چنگل سے آزاد کرانا ذوالفقار علی بھٹو کے بڑے کارناموں میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ زرعی اصلاحات، عوام کو سستی ٹرانسپورٹ اور خوراک سمیت بنیادی مراکز صحت کا قیام اور غریبوں کے لیے علاج کی مفت سہولیات، تعلیم اور علاج کے لیے بجٹ کا ۴۳ فیصد مختص کرنا، پاکستانی عوام کو شناخت دینے کے لیے قومی شناختی کارڈ بنوانے کے لیے قانون سازی اور دیگر اصلاحات شامل ہیں۔

حکومت قائم ہونے کے تین سال کی کوششوں کے بعد بھٹو ایک متفقہ آئین دینے میں بلآخر سرخرو ہوئے۔ ملک میں جمہوریت کے استحکام، تسلسل اور پسے ہوئے طبقات کو حقوق دینے کے لئے یہ آئین پاکستان کا تاریخ ساز کارنامہ تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اس بات کو محسوس کیا کہ ہندوستان پاکستان کو ایک بار تقسیم کر چکا ہے اور اب وہ یہ کوشش بار بار کرے گا لہذا پاکستان کا ایٹمی صلاحیت حاصل کرنا خطے میں طاقت کے توازن کے لیے ایک لازمی امر ہے ۔ لہذا ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا آغاز کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے دنیا کے ستتر ترقی پزیر ممالک کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور مشترکہ مسائل کو ایک ہی پلیٹ فارم سے حل کرنے کی کوششوں کا انعقاد کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا نہ صرف انعقاد کیا بلکہ مسلم امہ کے اتحاد کے لیے ایسے گراں قدر فیصلے بھی کروائے جن کے سبب ذوالفقار علی بھٹو مغربی طاقتوں کے لیے ایک خطرہ بن کر ابھرے۔ آفتاب اقبال شمیم اس عظیم ستون کی پھانسی کے منظر کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

یہاں سے آگے نشیب ہے اور اس سے آگے
غروب کی گھاٹیاں ہیں جن میں

لڑھک کے روپوش ہو گیا ہے
سوار دن کا
ذرا ذرا سے چراغ لے کر ہتھیلیوں پر
چلے ہیں بالشتیے اندھیرے کے چوبداروں کے پیچھے پیچھے
قدم ملاتے ہوئے صدا پہ صدا لگاتے
بتاؤ یہ آنکھ کا خلا ہے کہ وقت کا شہ نشیں ہے خالی
کہاں گیا ہے مکیں مکاں کا
کھلا ہے دروازہ آسماں کا[۲]

"افریقہ ــــــــــ اگلے محاذ پر" آفتاب شمیم کی وہ نظم ہے جس میں انھوں نے افریقی عوام پر سامراجی طاقتوں کے ظلم و ستم کو پیش کیا ہے۔انھوں نے یہ نظم افریقہ کی جنگ آزادی کے پس منظر میں لکھی ہے جو ان کی عالمی بصیرت کی گواہی اور اعلیٰ شاعری کا نمونہ ہے۔ افریقہ قدرتی وسائل سے مالا مال براعظم ہے مگر آج کی جدید دنیا میں بھی اس کے زیادہ تر ممالک ترقی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں-ماضی میں اس کی کئی نسلیں انسانی لالچ،طاقت کے خمار،قدرتی وسائل پر قبضے اورنسل پرستی کی بھینٹ چڑھ گئیں-طاقت و معاشی کھینچاتانی میں براعظم افریقہ کے لوگ آج بھی دنیا میں انسانی حقوق کے علمبرداروں کے سائے میں اپنی رنگت اور نسل کی وجہ سے مسائل سے دو چار ہیں-

افریقہ کے ایک ایسے ہی ملک،جنوبی افریقہ کے باشندوں نے تقریباً پانچ صدیوں پر محیط آزادی کی ایک طویل جنگ لڑی ہے لیکن ابھی بھی افریقی عوام سامراجی طاقتوں کے سامنے بے بس نظر آتی ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے اتحادیوں کی مدد سے ان کے گرد ایسا جال بچھایا ہوا ہے جس کی زد سے نکلنا ان کے لیے دشوار تر معاملہ بنتا جا رہا ہے۔افریقی نسل کے ساتھ رنگ و نسل کی بنیاد پر امتیازی سلوک برتا جا رہا ہے جس کی مثال ایک افریقی بچہ صرف افریقی ہسپتال میں پیدا ہوتا،صرف افریقی بس میں گھر لے جایا جاتا،صرف افریقی علاقہ میں رہتا اور صرف افریقی سکول میں جاتا،اگر وہ سکول جا پاتا-یعنی ایک افریقی بچہ جس ہسپتال میں پیدا ہوتا اس کے دروازے پر لکھا ہوتا ہے صرف افریقی ، وہ جِس علاقے میں رہتا ہے ، جِس بس میں گھر جاتا ہے اور جِس سکول میں پڑھتا ہے اگر سکول میں داخل کرایا جاتا ہے تو ان سب پر صرف افریقی کا لیبل چسپاں ہوتا ہے۔اس تمام تر بدترین صورت حال کے باوجود آفتاب اقبال شمیم مستقبل سے پر امید

ہیں کہ افریقی نسل میں ایسے عظیم نجات دہندہ جنم لیں گے جو سامراجی قوتوں کی جڑیں کاٹ ڈالیں گے۔آزادی ان کا مقدر بنے گی۔بقول آفتاب اقبال شمیم:

عنتر نے دھاوا بولا ہے
دیکھ! سفید انسانیت کے خیموں پر
پنجے سخت طنابوں کے
جنگل کے محکوم بدن پر ڈھیلے پڑتے جاتے ہیں
کل کے طبل پہ چوٹ پڑی ہے
دیکھ! تڑپتی شہ رگ کی
ہر ہر بستی میں مینار الاؤ کے
روشن ہوتے جاتے ہیں
کل آزادی کی ہریالی پھوٹے گی۔۔۔۔اور یہ بیلیں
پیڑوں کا رس پینے والی نیلی بیلیں
جڑ سے کاٹی جائیں گی[۷]

"اعلان نامہ بیروت" سامراجی حوالے سے آفتاب اقبال شمیم کی ایک اہم نظم ہے جس میں انھوں نے سامراجی طاقتوں کی تباہ کاریوں کو موضوع بنایا ہے۔بیروت لبنان کا سابق تجارتی مرکز ہے۔لبنان کی خانہ جنگی سے پہلے یہ شہر مشرق وسطیٰ کا پیرس شمار ہوتا تھا۔ لبنان کا تقریباً تمام علاقہ ساحلی ہے۔پہلے پہل جہاز رانی انھوں نے شروع کی۔یہاں بے شمار انبیا مبعوث ہوئے۔کئی تہذیبوں نے جنم لیا۔پہلی صدی عیسوی میں رومن افواج ان پر چڑھ دوڑیں۔مسلمانوں نے بھی انہیں فتح کیا۔اسی لیے آج لبنان ایک ایسا ملک ہے جس میں آپ مختلف نسلوں اور مذاہب کے لوگ دیکھ سکتے ہیں۔یہ ملک ایشیا کے آخری سرے پر یورپ کے قریب واقع ہے اس لیے اسے ہم مختلف تہذیبوں کا مرقع کہہ سکتے ہیں۔ایک بات جو ان میں برقرار ہے وہ ان کی آزادی سے محبت اور جنگجو ہونا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد عثمانی خلافت ختم ہو گئی اور لبنان کے پانچوں اضلاع کو جمعیت الاقوام یا لیگ آف نیشنز (جو بعد میں اقوام متحدہ بن گئی) نے فرانس کو سونپ دیا۔فرانس نے حسب سابق مارونی مسیحیوں کو ہر معاملہ میں آگے رکھا۔لبنان نے ۱۹۴۳ء میں فرانس سے آزادی حاصل کی

جس وقت فرانس پر جرمنی نے قبضہ کر لیا تھا۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی لبنان پر مختلف سامراجی قوتوں کا تسلط قائم رہا ہے جو تا حال جاری ہے۔ ۱۹۷۵ء سے شروع ہونے والی کا خانہ جنگی کے پیچھے بھی سامراجی طاقتوں کا ہاتھ تھا۔ اسرائیل ہر دور میں لبنان کے اندرونی اور خارجی معاملات میں دخل اندازی کرتا رہا ہے۔ اسرائیلی جنگی طیاروں کے حملوں نے بیروت کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ بارود کی بارش نے ہنستی بستی بستیاں اجاڑ دی ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم آزادی کے متوالوں سے مخاطب ہیں کہ ایک مرد مجاہد کی شہادت کے بعد کوئی اور مرد مجاہد اس کی آزادی کی جنگ کے لیے مورچہ سنبھالے گا۔

شاعر اس تمام تباہ کن صورت حال کے باوجود ناامید نہیں ہے وہ اقبال کے اس تصور کا قائل ہے کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔ آفتاب اقبال شمیم لہو میں نہائی نسل سے توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں کہ ایک دن غلامی کا سورج ڈوبے گا اور آزادی کا چمکتا ہوا سورج ضرور طلوع ہو گا۔ بہار کا موسم آئے گا اور یہ سامراجی طاقتوں کی خون ریزی اپنے بھیانک انجام کو پہنچے گی۔ شاعر اپنے ان خیالات کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

زمیں سے زمیں تک
نئی، ایک ہی ملکت کے اُبھرنے کا پیغام دے
جس کے خورشیدِ فردا نما برج پر
وہ لہو میں نہائی ہوئی نسل کے
خواب فردا کی پرچم کشائی کرے جس میں بے خانماں، ہجرتوں کے سفر میں
بھٹکتے ہوئے قافلوں کو
ارادے کی آزادیاں پیش کرنے کی تقریب پر
ہر کفِ شاخ کو
دستِ موسم
گلوں سے حنائی کرے [۵]

"بے انتا کا سپنا" آفتاب اقبال شمیم کی طویل نظم ہے جس میں انھوں نے کھل کر اپنے نظریاتی خوابوں کا ظہار کیا ہے جس کی آئینے میں ویت نام کی تحریک مزاحمت، امریکی سامراج کی چیرہ دستیاں، یورپ کے تاجر پیشہ ور اور نو آبادیاتی نظام کے بانی سامراجی اقوام کی خون آشامی، ویت نامیوں کے عزم اور حوصلے کی داستان بیان کی ہے۔ انھوں نے جلی ہوئی بستیوں کے ملبے، خون آلود مناظر سبھی کچھ واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ آفتاب اقبال شمیم سامراجی قوتوں

کو سفید گدھ کہتے ہیں جو غریب ممالک کا گوشت نوچ رہی ہیں۔ ویت نام میں جنگ کی خون ریزی میں بہت زیادہ لوگ لقمہ اجل بنے۔ فوجیوں کے علاوہ شہری آبادی کا بھی ہلاکتوں اور زخمی ہونے کی صورت میں بڑے پیمانے پر جانی نقصان ہوا۔ جنگ ویت نام ۱۹۵۵ء سے ۳۰ اپریل ۱۹۷۵ء تک جاری رہنے والا ایک عسکری تنازع تھا۔ کہنے کو یہ جنگ شمالی ویت نام اور جنوبی ویت نام کے مابین لڑی گئی لیکن اس جنگ میں متعدد قوتوں نے حصہ لیا۔ اس جنگ کو کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے جنگ ویت نام کے علاوہ اسے دوسری انڈو۔چائنا جنگ اور امریکا کے خلاف مزاحمتی جنگ بھی کہا جاتا ہے۔

شمالی ویت نام کو سوویت یونین، چین اور دیگر کمیونسٹ اتحادیوں کی حمایت حاصل تھی۔ جنوبی ویت نام کی فوج کو امریکا، جنوبی کوریا، آسٹریلیا، تھائی لینڈ اور کمیونسٹ مخالف ممالک کی حمایت حاصل تھی۔ اس لیے اس جنگ کو ''سرد جنگ'' یا پراکسی جنگ بھی کہا جاتا ہے۔ اس جنگ میں ویت کانگ جسے قومی محاذ آزادی بھی کہا جاتا تھا جنوبی ویت نام سمیت علاقے میں کمیونسٹ مخالف قوتوں کے خلاف چھاپہ مار کارروائیاں کرتا رہا۔ اسی دوران شمالی ویت نام کی فوج جسے ویت نام عوامی فوج بھی کہا جاتا تھا روایتی مخالفین سے روایتی جنگ لڑتی رہی جس میں بڑی تعداد میں افواج آمنے سامنے لڑتی ہیں۔ جنوبی ویت نام کی افواج کو امریکی مدد کے سبب فضائی برتری حاصل رہی۔ اس دوران امریکا نے شمالی ویت نام میں بڑے پیمانے پر بمباری کی۔ شمالی ویت نام اور اس کے اتحادیوں نے بالخصوص امریکا کے خلاف ایک کامیاب جنگ لڑی اور ویت نام کو ایک متحدہ ریاست کے طور پر قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ شاعر اس جنگ کی خون ریزی کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

اجنبی گورکنوں کو میں نے
اس جگہ بھیجا ہے
جو مری آگ میں کفنائے ہوئے شہروں کو دفنائیں گے
اے ہیوئے کے مقدس کاہن!
تو نے اس شہر کے مردوں کو کہاں بھیجا ہے
شہر کیوں خالی ہے [۹]

سامراجی سازشوں کی یہ ایک اچھی مثال ہے کہ کیسے انھوں نے شمالی ویت نام اور جنوبی ویت نام کو آپس میں ہی دست و گریباں کر دیا۔ اس جنگ میں سامراجی طاقتوں نے خون کی ہولی کھیلی۔ اس جنگ میں جہاں ویت نام کا

نقصان ہوا وہاں امریکہ کو بھی بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ تمام تر جنگی طاقت اور جدید ہتھیاروں کے جارحانہ استعمال کے باوجود امریکہ کو شکست فاش ہوئی۔ امریکہ نے اس جنگ کو جیتنے کے لیے سفاکانہ حربوں کی ہر حد کو پار کیا۔ شیخ جابر اپنے ایک مضمون "ویت نام کی فتح یا شکست" میں لکھتے ہیں کہ ویت نام جنگ کے دوران امریکا نے ویت نام پر شدید ترین بم باری کی۔ ۷۰ لاکھ بم برسائے گئے۔ یہ تعداد دوسری جنگ عظیم کے دوران گرائے جانے والے امریکی بموں سے دگنی تھی۔ لیکن تمام تر جنگی مظالم و جرائم کے با وجود امریکی یہ جنگ نہیں جیت سکے۔ جنرل جیاپ کی قدیم چینی جنگی حکمت عملی "سین زُو" کے طریقوں اور گوریلا جنگ کے طریقوں نے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ جنگیں صرف اعلیٰ ٹیکنالوجی اور افرادی قوت سے نہیں جیتی جا سکتیں۔[۱۰]

آفتاب اقبال شمیم ویت نام کی فتح کو اس طرح سراہتے ہیں:

اس طرف دیکھو جہاں
نوجواں لڑکوں نے اپنے ناخنوں سے آہنی دیوار کو
کر دیا ہے ناتواں
زندہ باد اے ویت نام[۱۱]

آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم "نہیں اور ہاں سے آگے" کے دوسرے حصے "دھوپ کا پھٹا ہوا بادبان" میں عالمی سطح پر سامراجی قوتوں کے پھیلائے ہوئے جال کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ تاریخ کی بھیانک حقیقتیں عہد جدید کی سچائیاں ہیں۔ تیسری دنیا کے دیگر ممالک کی طرح فلسطین کو بھی امریکی اور اسرائیلی جارحیت کا سامنا ہے۔ فلسطین کے بیشتر حصے پر ۱۹۴۸ء کے بعد اسرائیلی ریاست قائم کی گئی۔ اس کا دار الحکومت بیت المقدس تھا جس پر ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے قبضہ کر لیا۔ بیت المقدس کو اسرائیلی یروشلم کہتے ہیں اور یہ شہر یہودیوں، مسیحیوں اور مسلمانوں تینوں کے نزدیک مقدس ہے۔ مسلمانوں کا قبلہ اول یہیں ہے۔ تاریخ کے بادشاہوں نے زمین کے خشک خطوں میں اپنے چرواہے انسانی ریوڑ چرانے کے لیے مقرر کر رکھے ہیں۔ ان سامراجی آقاؤں کے محل عیش فراواں سے آباد ہیں۔ انسانیت کی محکومی اور اس کے نام نہاد خیر خواہوں کی بقا کے لیے سامراج ایٹمی آگ لگانے پر دسترس رکھتا ہے اور آزادی کی تحریکوں کو تقسیم کر کے بے آسرا کر دیتا ہے۔ ان حالات کو بیان کرنے میں شاعر طنز کو بطور ایک موثر حربے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اسرائیل نے فلسطین کو ایک قتل گاہ میں تبدیل کر دیا ہے جہاں آئے روز معصوم اور نہتے فلسطینوں کے لہو کی ندیاں بہائی جا رہی ہیں۔ بقول آفتاب اقبال شمیم:

فلسطیں کی نئی تعمیر کردہ قتل گاہوں تک
لکھی ہوں گی لہو میں
سب کی سب شہ سرخیاں
تیرے جریدے پر
کہ تو باطن ہے ہر لمحے کے باطن کا
ہمارے بادشاہوں نے
مقرر کر رکھے ہیں اپنے چرواہے [12]

سامراجی طاقتیں اپنی سامراجیت کو قائم رکھنے کے لیے نت نئے حربے اختیار کرتی ہیں۔ سیاسی چالیں چلتی ہیں جو محکوم لوگوں کو متضاد گروہوں میں تقسیم کر دیتی ہیں۔ آزادی حاصل کرنے کی انتھک کوششوں میں آزادی کے متوالے اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم تیسری دنیا کے ممالک پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی انا ان کی غیرت کہیں بازاروں میں بک گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سامراجی قوتیں ان پر اپنا غاصبانہ قبضہ جما لیتی ہیں۔ نئے سامراجی آقا بھی پرانے سامراجی آقاؤں کی طرح تیسری دنیا کے ممالک کی تہذیب و ثقافت کو کمتر اور گھٹیا سمجھتے ہیں اور ان کے مطابق اس دنیا کے باشندوں کو انسانیت سکھانے کے لیے ایک نئی تہذیب کی ضرورت ہے۔ سامراجی طاقتیں میڈیا کے ذریعے اپنی ثقافت کو فروغ دینے میں مصروف عمل ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم طنزاً کہتے ہیں کہ اے تیسری دنیا کی محکوم قوم ان نئے سامراجی آقاؤں سے اجنبیت محسوس نہ کریں کیونکہ آپ ان کے سابقہ غلام ہیں۔ بقول شاعر:

نیا آقا
نئے رشتے کی بنیادوں پہ کیسی اجنبیت،
کیسی تنہائی کی دیواریں اٹھاتا ہے
بتا! تیرے پرانے بسنے والے کیا کریں
تو نے تو سب زرخیزیاں تقسیم کر ڈالی ہیں
نو آبادکاروں میں [13]

آفتاب اقبال شمیم کی نظم "دھوپ ندی کا ماجھی (بنجمن مولائزے کی نذر)" میں سامراجی طاقتوں کی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہیں کہ کیسے یہ ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

اس نظم میں آفتاب اقبال شمیم نے جنوبی افریقہ کے عظیم سیاسی رہنما اور انقلابی شاعر بنجمن مولائزے کو تختہ دار پر لٹکانے کے مناظر کو پیش کیا ہے۔ مولائزے افریقی نیشنل کانگرس کا رہنما تھا اور انقلابی ہونے کی وجہ سے سامراجی طاقتوں کی نظر میں تھا۔ انہیں قتل کے الزام میں سزائے موت سنادی گئی۔ دنیا بھر سے انہیں پھانسی نہ دینے کی اپلیں کی گئیں مگر حاکم وقت نے ان کی سزا ختم نہ کی۔ پھانسی کے بعد جنوبی افریقہ کے گلی کوچوں میں خون آشام لڑائیاں شروع ہو گئیں۔

بنجمن مولائزے نے اپنی پھانسی سے قبل مشہور جملے کہے جن کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ میں جو کچھ بھی ہوں اس پر مجھے فخر ہے۔ میری دردناک موت کے بعد ظلم و جبر کا طوفان آئے گا۔ مجھے اپنی جان پر فخر ہے۔ ایک میری تنہا زندگی۔ اس نظم میں آفتاب اقبال شمیم نے مولائزے کے قتل کے بعد ظلم و جبر کے خلاف ایک پیغام اقوام عالم کو دیا کہ عظیم مقاصد کی خاطر لڑنے والے عظیم رہنما ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ مثالی انسانی معاشرہ انسانی زندگی کی قربانیاں مانگتا ہے۔ ایک خوشگوار ماحول اور فضا کو جنم دینے کے لیے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ ناانصافی اور معاشرتی جبر و ناہمواری کے خاتمے کے لیے انقلابی روحوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آفتاب اقبال شمیم اس عظیم رہنما کی پھانسی کے منظر کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

دھوپ کی مغویہ اور وہ
شعر کی کنج روشن میں سرگوشیاں کر رہے تھے
کہ پکڑے گئے
ظلمتوں کے کماں دار مقتل کی جانب
لیے جا رہے ہیں انہیں
ایک ہو کی صدا آبنوسوں سے اٹھتی ہوئی
سن ذرا دستکیں بستیوں میں
جہاں گیر پیغام کی
دیکھ! اس دار پر [۱۴]

"زیطہ" آفتاب اقبال شمیم کی ایک اہم نظم ہے۔ یہ ایک کرداری نظم ہے جس کا مرکزی کردار زیطہ ہے۔ زیطہ نجیب محفوظ کے ناول کا کردار ہے۔ جبر کی عالمی قوتوں اور سازشوں نے نہ صرف غریب اقوام کا معاشی استحصال کیا ہے بلکہ ان پر جنگیں مسلط کر کے انسانیت سوز سلوک بھی روا رکھا ہے۔ عالمی طاقتیں اپنے معاشی مفادات کی خاطر پس

مانندہ اقوام کو لوٹ رہی ہیں۔ پہلے وہ انہیں محتاج بناتی ہیں پھر انہیں مختلف حیلوں بہانوں سے مجبور کرتی ہیں کہ وہ محتاجی کا طوق اپنے گلے سے نہ اتاریں۔ آفتاب اقبال شمیم زیطہ کے ذریعے عالمی طاقتوں کے غریب عوام کو اپاہج بنانے کی سوچ پر طنز کرتے ہیں۔ زیطہ ایک جراح ہے جو معذور لوگوں کا علاج کرتا ہے اور جراحی کے عمل سے ان کے کٹے ہوئے اعضاء کو جوڑتا ہے۔ زیطہ ایک ایسے معاشرے کا حصہ بھی ہے جہاں پر معاشی اور اقتصادی حوالوں سے طاقت ور اقوام کمزور اقوام کو اپنے زیر تسلط رکھتی ہیں۔ ان کی معذوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا معاشی استحصال کرتی ہیں اور انہیں تنزلی کی راہ پر چلنے پر مجبور کرتی ہیں۔

آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم "دوسرے منظر کی بازگشت" میں پاکستانی سیاست اور آمرانہ نظام حکومت پر طنز کرتے ہیں۔ سیاست دانوں کے منفی رویوں سے پاکستان کا سیاسی نظام ہمیشہ ہی انتشار کا شکار رہا۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی سیاسی اور معاشرتی عدم استحکام کی روایت سی پڑ گئی۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگیں، تین دفعہ مارشل لا اور ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ایسے باب ہیں جن سے سیاسی نظام میں امریت کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے سیاسی نظام میں سامراجیت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سیات چند خاندانوں تک محدود ہے۔ پاکستان کی تخلیق ایک خواب کی تعبیر ہے۔ قیام پاکستان کے وقت لوگوں نے پاکستان کے بارے میں بہت سے خواب دیکھے تھے جن کی تعبیر ان سیاست دانوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اسلامی اور فلاحی ریاست کا خواب دم توڑتا محسوس ہوتا ہے ۔ لوگوں کی پاکستان کے قیام سے بہت سی امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں جو اب لگتا ہے کہ وہ محض لوگوں کا خواب تھیں۔

پاکستان بہت سے مسائل سے دوچار ہے۔ پاکستان کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے جبکہ وسائل میں اسی شرح سے اضافہ نہیں ہو رہا۔ آبادی میں تیزی سے اضافے سے بے روزگاری بڑھ رہی ہے جس کا حل صنعتی ترقی، سرمایہ کاری اور عوام میں مہارتوں کا فروغ ہے۔ ملک کے بہت سے شہروں اور علاقوں میں عدم تحفظ کی موجودہ صورتحال نے منظم جرائم، مذہبی منافقت، پرتشدد انتہا پسندی اور سیاسی موقع پرستی کے آمیزے سے جنم لیا ہے۔ پاکستان میں سلامتی کے بارے میں دنیا بھر میں پائے جانے والے خدشات حقیقی خطرات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ جب تک تحفظ اور سلامتی کا مسئلہ حل نہیں کیا جائے گا اس وقت تک کوئی بیرونی یا ملکی سرمایہ کاری یا ترقیاتی منصوبے عمل میں نہیں آ سکتے۔ ہمارے ہاں بہت سے ایسے معاشرتی مسائل موجود ہیں جو ایک فلاحی مملکت بننے کی راہ میں حائل ہیں۔ سب سے ضروری چیز، جو کسی قوم کے لیے ترقی کے زینے کا پہلا قدم قرار پاتی ہے، وہ اس کی اخلاقی حالت

ہے۔ قول و فعل کے تضاد، جھوٹ، دھوکہ دہی اور مکر و فریب ایسے اخلاقی رزائل ہیں جن کی موجود گی میں کوئی قوم خواہ کتنے ہی علوم سے بہرہ ور ہو، کتنے ہی زمینی وسائل سے مالا مال ہو اور کتنی ہی افرادی قوت کی حامل ہو، ترقی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ معاشرتی مسائل زوال کو دعوت دیتے ہیں۔

پاکستان کی موجودہ صورت حال دیکھ کر شاعر کچھ مایوس نظر آتا ہے کیونکہ اسے سیاسی نظام میں کوئی تبدیلی ہوتی نظر نہیں آتی۔ ہمارے سیاست دان مغربی سامراجیت کی زد میں ہیں۔ پاکستان کے حال اور مستقبل کے تمام فیصلے مغربی سامراج کی منشا کے مطابق ہوتے ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم پاکستان کے آمرانہ نظام کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

تغیر ایک ڈھارس ہے بدلنے کی
یہی دس بیس برسوں کے اجالے میں
اور اس کے بعد اگلے آمروں کا دور آتا ہے
نشیبوں پر ذرا سے نخل کی مانند ہے دنیا
جو گہرے جبر کی وسعت میں پلتا ہے
وہ ہی رفتہ کا رفتہ
اور آئندہ کا آئندہ
ہمیشہ گھوم پھر کے مطلع منظر پہ چڑھتا اور ڈھلتا ہے [15]

آفتاب اقبال شمیم کی نظم "روداد۔۔۔۔۔۔ایک جلسے کی" ماضی کے پاکستان میں امریکی سازش کی ایک روداد ہے۔ شاعر نے اس نظم میں پاکستان کے ایک ناقابل فراموش واقعے کی منظر کشی کی ہے۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان کو راولپنڈی کے ایک جلسہ عام میں خطاب کے دوران گولی مار کر انہیں شہید کر دیا گیا۔ ان کی شہادت بے انجام افسانہ بن کر رہ گئی۔ سترہ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو خواجہ ناظم الدین کو وزیر اعظم منتخب کیا گیا جب کہ گورنر جرنل کے عہدے کو ملک غلام محمد نے سنبھالا۔ پاکستان ابھی نیا نیا معرض وجود میں آیا تھا۔ ہجرت کے بعد مہاجرین کی آبادی کاری کے مسائل کا حل ایک صبر آزما مرحلہ تھا۔ مغربی سامراجی قوتوں اور ہندوستان سے الگ اسلامی ریاست کا قیام برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان اور امریکہ نے پاکستان کو سیاسی منظر نامے پر غیر مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے ظفر سید اپنے ایک مضمون "کیا لیاقت علی خان کو امریکہ نے قتل کروایا؟ میں رقمطراز ہیں:

" لیاقت علی خان نے چند ماہ قبل ہی بھارت کو مکہ دکھایا تھا اور وہ کشمیر پر حملہ کرنا چاہتے تھے، اس لیے بھارت نے انہیں راستے سے ہٹا کر پاکستان میں انتشار پیدا کر دیا"

لیاقت علی خان کو امریکی صدر ہیری ٹرومین نے قتل کروایا کیوں کہ امریکہ نے پاکستان سے مطالبہ کیا کہ وہ ایران کو راضی کرے کہ وہ اپنے تیل کے ذرائع کا کنٹرول امریکہ کو منتقل کر دے لیکن لیاقت علی خان نے انکار کر دیا، بلکہ الٹا امریکہ کو پاکستان میں موجود فوجی اڈے خالی کرنے کا حکم دے دیا۔[16]

اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بھی سامراجی آقاؤں نے پاکستان کے کسی بھی معاملے میں اپنی دخل اندازی کو ترک نہیں کیا خواہ یہ سیاسی معاملہ ہو یا معاشی، اقتصادی معاملہ ہو یا معاشرتی، مذہبی معاملہ ہو یا ثقافتی، تعلیمی ہو یا سماجی۔ آفتاب اقبال شمیم اس دکھ بھرے واقعے کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

نامولود زمانے کا
ہال بھرا تھا غیب کے سننے والوں سے
شام کو ہونے والی اس تقریب رونمائی میں
ہم نے بھی مضمون پڑھا
اس صدیوں پر
جو ندی کے گھاٹ پہ بیٹھے
بہتی ریت سے ذرہ ذرہ
سونا چنتی رہتی ہیں
ویسے تو
ہم نے اس مضمون کے اندر
معنی کے معنی ڈھونڈے تھے[17]

آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم "رہٹ چلتا ہے" میں تیسری دنیا پر سامراجی طاقتوں کے فضائی حملوں کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ تیسری دنیا میں وہ ممالک شامل ہیں جو غریب، پسماندہ، مفلوک الحال اور ترقی پذیر ممالک ہیں۔ تیسری دنیا کے معاشی حالات خراب ہونے میں مغربی ممالک کی مداخلت کا بھی تو دخل ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک کو آئی۔ ایم۔ ایف نے بری طرح قرضوں میں جکڑ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے ہر شعبہ زندگی

میں بے جا مداخلت کر کے اپنا اثر ورسوخ قائم رکھتے ہیں۔قرضوں کی وجہ سے تیسری دنیا کے ممالک غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

آئے روز امریکہ اور اس کے اتحادی ان غریب اور بے بس ممالک پر مختلف حیلے بہانوں سے حملے کرتے رہتے ہیں۔اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جنگ دور جدید کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ترقی یافتہ سامراج نے غریب اور نہتے ممالک پر جنگ مسلط کی ہوئی ہے۔اس نظم میں شاعر اچانک فضائی حملوں سے پیدا ہونے والی صورت حال کو پیش کرتے ہیں ۔اب سامراجی طاقتوں کا سرغنہ امریکہ ہے جو آئے روز دہشت گردی کو ختم کرنے کے بہانے سے مختلف ممالک پر فضائی حملے کرتا ہے۔اس کی مثال پاکستان پر ڈرون حملے بھی ہیں جن میں بہت سے معصوم پاکستانی شہید ہوئے ہیں ۔امریکی ڈرون حملوں میں کیمیائی ہتھیار استعمال ہوتے ہیں جن کے اثرات انتہائی خطرناک ہیں۔جب یہ حملے ہوتے ہیں تو لوگوں میں خوف وہراس پھیل جاتا ہے۔ان حملوں میں شہیدوں کی لاشوں کے چیتھڑے سامراجی طاقتوں کے ظلم و جبر اور استبداد کی روداد بیان کرتے ہیں۔ہر طرف افراتفری اور خوف کے سایے منڈلانے لگتے ہیں۔آفتاب اقبال شمیم اس منظر کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یاد ہے،ہاں مجھے یاد ہے
ڈار کووؤں کی آکر فضا میں معلق ہوئی۔۔۔۔آن کی آن میں
ایک ٹھٹھر ہوئی چیخ رستوں کی رونق مٹانے لگی
چار سو خوف کے گھوکر وسے اگانے لگی
آرہے ہیں رتھوں سے بندھے اور گھسٹتے ہوئے
چیتھڑا بستیوں کے بدن
اور میں اپنے بچوں کو لے کر قدم بے قدم بھاگتی ہی گئی [۱۸]

سامراجی طاقتیں خود کو تہذیب و ثقافت کا مینار نور سمجھتی ہیں۔ مگر مغربی تہذیب مسلمانوں کو ان کی اسلامی معیار اور اقدار سے بہت دور کر رہی ہے اوراس کہ اصل مقصد بھی یہی ہے کہ ہم اُن پر منحصر کرنا شروع ہو جائیں تاکہ وہ آسانی سے ہم پر غلبہ پا لیں۔بیرونی طاقتوں کی یہی کوشش رہی ہے کہ کسی بھی طریقے سے اسلامی تہذیب کو ختم کروا کر مغربی تہذیب کو متعارف کروایا جائے۔ ان اعلیٰ تہذیب کے علمبرداروں نے اپنی تہذیب سے یہی سیکھا ہے کہ اپنے جیسے انسانوں کا لہو کیسے چاٹنا ہے؟ان کو غلام

کیسے بنانا ہے ؟ کیسے ان کی ذہنی اور فکری صلاحتیوں کو مفلوج کرنا ہے ؟ کیسے غریب ممالک کے قدرتی وسائل کو لوٹنا ہے ؟ نظم سے حوالہ:

لوٹ کر لے گئی
نوع ہم ذات کو زور آور کی تہذیب نے
اپنے ہم صورتوں کا لہو چاٹنے کے صلے میں
زمیں، عورتیں اور حبشی غلاموں کے ریوڑ دیے
بستیاں لوٹنا شیر مردوں کا عزاز مانا گیا[19]

"نیوکلیئر ہولوکاسٹ سے پہلے" میں آفتاب اقبال شمیم ماضی کے بھیانک واقعے کا تعلق حال کے جدید جوہری توانائی کے پروگرام سے منسوب کرتے ہیں۔ ہولوکاسٹ انسانی تاریخ کا وہ لرزہ خیز واقع ہے جو آج بھی انسان کو لرزہ دیتا ہے۔ ہولوکاسٹ نازی حکومت اور اس کے حلیفوں کی طرف سے تقریباً چھ ملین یہودیوں کا ایک منظم کیا جانے والا ظلم وستم اور قتل عام تھا۔ لفظ ہولوکاسٹ یونانی زبان سے اخذ شدہ ہے جس کا مطلب "آگ سے قربانی ہے"۔ جرمن قوم کا خیال تھا کہ وہ نسلی طور پر یہودی قوم سے اعلیٰ ہیں۔ نازی حکومت نے بہت بے دردی سے یہودی عورتوں، مردوں اور بچوں کو قتل کیا۔ ماضی کے اس دردناک واقعے سے انسان نے کچھ نہیں سیکھا کیونکہ اس نے نیوکلیئر ہتھیاروں کی ایجاد اور استعمال میں دوڑ لگائی ہوئی ہے۔ جرمن قوم کی طرح عہد جدید میں امریکی بھی اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ اعلیٰ نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ باقی ممالک کے لوگ ان سے کمتر ہیں۔ اس لیے امریکی مختلف ممالک میں بے گناہ لوگوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ اپنا نسلی تسلط قائم کرنے کے لیے امریکہ نیوکلیئر ہتھیاروں کی ایجاد اور خرید و فروخت کی دوڑ میں سب سے آگے ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کا یہ رویہ انسانی جانوں کے ضیاع کی وجہ بن رہا ہے۔ جہاں بھی دنیا بھر میں ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال ہوا وہاں کی زمین بنجر ہو گئی۔ انسانی بصیرت کا تقاضا یہ ہے کہ جوہری توانائی کو انسانی فائدے کے لیے استعمال کیا جائے۔ بقول آفتاب اقبال شمیم:

زمیں کی مٹی ظریف لہجے میں سوچتی ہے
یہ میرا اگر سا آدمی کس طرف رواں ہے
تو کیا یہ خود کو جلا کے
اپنے وجود کی مشت بھر سیاہی سے میرا چہرا
بگاڑ دے گا؟

یہ بے نگاہی نہیں تو کیا ہے [20]

آفتاب اقبال شمیم نے اپنی نظم "سقوط بغداد" عراق میں ہونے والی تباہی کو پیش کیا ہے۔اس نظم میں شاعر نے بغداد کی تاریخی تباہی کو بیان کیا ہے۔ ۱۲۵۸ء میں منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی اور خلافت عباسیہ کے خاتمے کو سقوط بغداد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔منگولوں کے اس جارحانہ حملے سے بغداد شہر مکمل طور تباہ و برباد ہو گیا۔اس حملے میں بغداد شہر کو جلا دیا گیا اور لاکھوں کی تعداد میں عراقیوں کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔بغداد کے کتب خانے بھی چنگیز فوج کے حملوں میں نذر آتش کر دیے گئے۔ہلاکو خان کی زیر قیادت منگول افواج نے خلافت عباسیہ کے دار الحکومت بغداد کا محاصرہ کر کے شہر فتح کر لیا اور عباسی حکمران مستعصم باللہ کو قتل کر دیا۔شہر میں لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا اور کتب خانوں کو نذر آتش اور دریا برد کر دیا گیا۔جنگ کے بعد منگولوں نے شام پر حملہ کیا اور دمشق، حلب اور دیگر شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اس شکست کے ساتھ ہی امت مسلمہ کے عروج کا دور اول ختم ہو گیا۔آفتاب اقبال شمیم بغداد کی اس تباہی کی منظر کشی کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

سفید کرگس ضیافتوں کی اڑان میں تھے
سلگتے ملبے کی ڈھیریوں میں کھڑا سماوی
(سمے کی روداد لکھنے والا۔خدا کا مخبر)
شکستہ لہجے میں کہہ رہا تھا
یہاں مقدر کا شہر بغداد سو رہا ہے
کھنڈر کے نیچے [21]

نظم "۲۰۰۸ء کا سال" آفتاب اقبال شمیم نے احمد فراز اور محمود درویش کی نظر کی ہے۔یہ فلسطین کے مشہور شاعر تھے جنہوں نے اپنی شاعری کو فلسطینی مسئلے کو اجاگر کرنے کے لیے استعمال کیا۔محمود درویش پورے مشرقِ وسطیٰ میں مشہور تھے اور انہیں فلسطین کا قومی شاعر سمجھا جاتا تھا۔انہوں نے فلسطینوں کے اپنی ریاست کے خواب کو شاعری کے روپ میں بیان کیا اور سن انیس سو اٹھاسی میں فلسطینی آزادی کے اعلان کو ممکن بنانے کے ساتھ ساتھ فلسطینی قوم کی شناخت کو اجاگر کرنے میں مدد دی۔محمود درویش نے ایک مزاحمتی شاعر کی حیثیت سے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز کیا اور بعد میں فلسطینی ضمیر کی آواز بن گئے۔محمود درویش کی شاعری کے اردو سمیت بیس سے زائد زبانوں میں

ترجمے ہو چکے ہیں۔انہیں اپنی شاعری کے لیے کئی بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا۔احمد فراز پاکستان کے مشہور و معروف شاعر تھے۔وہ ہر دور میں احتجاج کا پرچم بلند کرتے رہے جس کی پاداش میں انہیں مختلف صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ایسے حالات بھی آئے کی انہیں جلاوطنی سہنی پڑی۔احمد فراز کو متعدد قومی اعزازات سے نوازا گیا جن میں آدم جی ادبی انعام، کمال فن ایوارڈ، ستارہ امتیاز اور ہلال امتیاز سے نوازا گیا۔یہ دونوں عظیم شاعر ۲۰۰۸ء میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔بقول آفتاب اقبال شمیم:

دو ہزار آٹھ کا سال
ہم سے محبت کے اس خواب گر کے
بچھڑنے کی تاریخ کا سال ہے
ظلمت شب میں جلتا ہوا اک چراغ ایک روشن نشاں
اور اس قبر میں
جو گل تر کی سانسوں بہائے ہوئے آنسوؤں سے
ابھی نم میں ہے
اور جس کی فضا، ایک جشن چراغاں کے عالم میں ہے
اس میں احمد فراز ایک خواب مسلسل کی
تعبیر کی خواب میں سو رہا ہے [۲۲]

ان دونوں شاعروں کے خواب ایک ہی طرح کے تھے اور یہ دونوں اپنے ان خوابوں کی تعبیر دیکھنے کی حسرت لیے ہی اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔ان کی شاعری میں رومانویت، احتجاج، مزاحمت اور انقلاب کے عناصر تھے۔ان کا خواب تھا کہ تیسری دنیا کے ممالک ان سامراجی قوتوں سے آزادی حاصل کر لیں کیونکہ یہ سامراجی قوتیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے پاکستان اور فلسطین کے معصوم اور نہتے شہریوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح کچل رہیں۔ان کی سفاکانہ جبریت نے ہر طرف خوف و ہراس پھیلا رکھا ہے۔سامراجی طاقتیں ایسے منصوبے بناتی ہیں جن کے پس پشت ان کے پوشیدہ مقاصد ہوتے ہیں تاکہ تیسری دنیا کے ممالک ترقی نہ کر سکیں۔ان کا سامراجی نظام قائم کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہماری صارفی منڈیاں ہمیشہ قائم و دائم رہیں۔اس لیے یہ دونوں عظیم شاعر اس سامراجی نظام کے خلاف تھے۔ان کی طرف سے گولہ بارود کی بارش سے اپنے ممالک کی زمینوں کی کوکھ اجڑنے سے پریشان تھے۔ان سامراجی طاقتوں نے ہر طرف اپنی سازشوں کا جال پھیلا رکھا ہے۔ان دونوں عظیم شاعروں کا یہ خواب تھا

کہ پاکستان اور فلسطین ان سامراجی قوتوں سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ آفتاب اقبال شمیم ان کے خوابوں کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

ابھی یہ زمیں
بد نما، شکل کش آمروں کے تسلط میں ہے
یہ گرج اسلحے اور بارود
یہ زر و زور کے دیوتا
جن کے ہر ملک میں نامزد کاہنوں اور تجار کا
حکم چلتا ہے [۲۳]

آفتاب اقبال شمیم کی نظم "خیال تعمیر کر رہا ہوں" تیسری دنیا کے فرد کا ایک ایسا خواب ہے جو اپنے حالات سے مایوس نہیں ہے۔ اسے اپنی مٹی سے پیار ہے کیونکہ اس کی دھرتی ماں نے اسے خوبصورت پیکر میں پروان چڑھایا ہے۔ اس کی زمین کو خدائے بزرگ و برتر نے ہر قدرتی وسائل سے نوازا ہے۔ خراب معاشی حالات اور ہر طرف پھیلے دہشت گردی کے خوف سے وہ پریشان ہے۔ وہ اپنے سامنے دہشت گردی کے حملوں میں انسانی جسموں کے چیتھڑے دیکھتا ہے۔ ملکی سامراجیت نے غریب کے لیے زندگی ایک قید خانہ بنادی ہے۔ حالات کی اس تمام تر سنگینی کے باوجود امید سانس لیتی ہے کہ کبھی سامراجی آقاؤں سے ان کی جان چھوٹے گی اور ہر طرف ترقی کی بہاریں اپنے رنگ بکھیریں گی۔ بقول آفتاب اقبال شمیم:

میں راج مزدور زندگی کا
خیال تعمیر کر رہا ہوں
میں آدمی اور کائناتوں کے ایک ہونے کا
خواب تعبیر کر رہا ہوں
ابھی تو تاریخ قبضہ گیروں کے جبر میں ہے
ابھی تو بیرون و اندرون میں
کئی خلیجوں کا فاصلہ ہے
میں فرد ہوں اور سوچتا ہوں [۲۴]

نظم "بخت خاں وار کر" آفتاب اقبال شمیم کی ایک کرادری نظم ہے۔ بخت خان روہیلہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ایک ایسا کردار ہے جسے نظر انداز کر جنگ آزادی کی داستان مکمل نہیں ہوسکتی۔وہ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں انگریزی فوج میں صوبہ دار تھے مگر بعد میں اس سے الگ ہوگئے اور آزادی کے متوالوں کی صف میں شامل ہوگئے۔انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں کود پڑے اور اپنے فوجی دستے سمیت وہ کا رہائے نمایاں انجام دیے جو آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ وقت نے وفا نہ کی اور ہندوستان کا یہ عظیم سپوت ملک کو غیر ملکی اقتدار سے آزاد کرانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔پہلی جنگ آزادی کو انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور شاطرانہ چالوں نے ناکام بنادیا۔

اس نظم میں آفتاب اقبال شمیم تیسری دنیا کے فرد میں بخت خاں کی کرداری خوبیاں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔وہ ان کے اندر سامراجی نظام سے آزادی حاصل کرنے کی تحریک پیدا کرنا چاہتے ہیں کیونکہ سامراجی نظام ہمارے ملکوں میں بہت مضبوطی سے پنجے گاڑھے ہوئے ہے۔سامراجیت کے استحکام میں تیسری دنیا کے سیاسی نظام کا بھی حصہ ہے ۔آفتاب اقبال شمیم تیسری دنیا میں ایک جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ترقی یافتہ قوموں کے سامنے اپنی عزتوں کو مجروح نہ کریں۔خود کفالت کی منازل طے کریں۔دن رات محنت کریں اور سامراجی طاقتوں کے سامنے دست سوال دراز نہ کریں۔تیسری دنیا کے تمام ممالک قدرتی وسائل سے مالا مال ہیں مگر ضرورت صرف محنت اور عزم کی ہے کہ ہم ترقی کی منازل طے کریں گے۔۔سامراجی نظام کے خاتمے کے لیے بیرونی سازشوں کو ختم کیا جائے۔جو بھی سامراج کے فوجی دستے مد مقابل آئیں بخت خاں کی طرح ان کو زندہ زمین میں گاڑھ دیا جائے۔موت سے خوف زدہ نہ ہوا جائے کیونکہ وہ اپنے وقت مقرر پر ہی آئے گی۔س حوالے سے آفتاب اقبال شمیم کی نظم "بخت خاں وار کر" کے الفاظ کچھ یوں ہے:

بخت خاں! وار کر
اس پرانے، زوال آشنا اور اندر کی تخریب و سازش کے
کھائے ہوئے کاخ و قلعہ کو مسمار کر
اپنی عزت کے منکر کا نکار کر
اور پھر اجنبی فاتحوں کے ہراول پہ
یلغار کر

جبر کی ہر کمیں گاہ جن کی حفاظت میں ہے
ترا انجام ہو گا وہی جو ہوا
پھر بھی اے بخت خاں، اپنے ہونے کا
اقرار کر!
جیت جا ہار کر[۲۵]

حوالہ جات

۱۔ ایڈورڈ سعید، *Culture and Imperialism*، (نیویارک، نوف، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۰۰۔

۲۔ http://urdulughat.info/words/3876 - سامراج

۳۔ http://irak.pk/american-imperialism-and-muslim/

۴۔ آفتاب اقبال شمیم۔ نادر یافتہ : کلیات ، سعید احمد (مرتب)، (اسلام آباد: پورب اکادمی ۲۰۱۶ء)، ص ۳۳۔

۵۔ ایضاً، ص ۳۴۔

۶۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔

۷۔ ایضاً، ص ۱۱۴۔

۸۔ ایضاً، ص ۱۲۷۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۹۷۔

۱۰۔ https://www.express.pk/story/185960/

۱۱۔ آفتاب اقبال شمیم۔ نادر یافتہ : کلیات ، سعید احمد (مرتب)، ص ۲۰۳۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۵۱۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۵۳۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۹۶۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۱۸۔

۱۶۔ https://www.independenturdu.com/node/18916/میگزین/تاریخ/کیا-لیاقت-علی-خان-کو-امریکہ-نے-قتل-کروایا؟

۱۷۔ آفتاب اقبال شمیم۔ نادر یافتہ : کلیات ، سعید احمد (مرتب)، ص ۴۰۶۔

۱۸۔ ایضاً، ۶۰۵۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۶۰۶۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۶۶۳۔

۲۱۔ ایضاً۶۳۵۔

۲۲۔ ایضاً،۷۷۹۔

۲۳۔ ایضاً، ص۷۸۰۔

۲۴۔ ایضاً، ص۶۹۵۔

۲۵۔ ایضاً، ص۶۶۲۔

باب سوم:

آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں جدید انسان کا تصور

باب سوم:

آفتاب اقبال شمیم کی نظم میں جدید انسان کا تصور

جدیدت سے مراد وہ فکری رویے ہیں جو قدیم سے انحراف کا نتیجہ سمجھے جاتے ہیں۔زیادہ تفصیل میں جائیں تو جدیدیت عقلی، علمی اور منطقی طورپر دنیا کو رجائیت اور ایقان کے ساتھ خوش انجامی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھنے اور اس کے لیے تگ و دو کا نام ہے۔جدیدیت میں اس امر کو ایک مطلق آفاقی اصول گردانا جاتا ہے کہ انسان کے لیے عقل اور منطق کے ذریعے ہی حقائق کا ادراک اور معاشرے کی ترقی ممکن ہے۔ جدیدیت کی مختصر تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ اپنے عہد کی زندگی کا سامنا کرنے اور اسے تمام خطرات و امکانات کے ساتھ برتنے کا نام ہے۔جدید یت ایک ایسا مستقل عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ہر عہد میں ان لوگوں نے جو حقیقی طور پر زندہ رہے ہیں اس عمل میں حصہ لیا ہے۔انھوں نے فکرو فن کی سطح پر فرسودہ اقدار کے خلاف جنگ کر کے نئی قدروں کی پرورش کی اور عملی زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالا ہے۔

جدیدیت کا ایک اور مطلب یہ بھی ہے کہ انسان مشین ہے۔ہم بطورانسان خالص طبعی دنیا میں رہتے ہیں اور دنیا میں وہی کچھ ہے جس کا فہم، ادراک یا احساس ہمیں اپنی حسیات کے ذریعے ہوتا ہے۔اسی لیے جدید ادب میں جدیدحسیات کا ذکرواذکارہوتا رہتاہے۔جدیدیت، ثقافت کو اعلیٰ اور ادنیٰ ثقافتوں میں تقسیم کرتی ہے اور صرف اعلیٰ ثقافتوں کو ہی مطالعے یا تجزیے کے لائق گردانتی ہے۔ایک جدید معاشرے میں جدیدانسان اپنے ارادے اور منزل کے تعین میں آزاد ہوتا ہے۔جدید ثقافت کی ہمہ گیریت، کثرتِ پیداوار بمقابلہ صارفیت اور منڈی کا پھیلاؤ کسی بھی جدید معیشت کا مطمع نظر ہوتا ہے۔اس رخ سے مادیت پسندی بھی جدیدیت پسندی میں داخل ہوتی ہے۔

جدیدحسیت اور معاشی نظریات اپنی علامتیں، اشارے، کنائے، رمزیں اور تلازمات اپنے ساتھ لاتی ہے جو جدیدیت کی تحریک کے پیروکاروں کی تحریروں میں اپنے معانی کی جولانیاں دکھانے لگتے ہیں۔نئے لکھنے والے یا دوسرے فنکار محض ادیب یا فن کار نہیں ہوتے کہ ثقافتی رجحانات اور تاثرات کو مجرد طورپر محفوظ کرتے جائیں بلکہ وہ انھیں تخلیقی سطح پر برت کر تجریدی اور

علامتی اظہار کے منفرد پیکر تراشتے ہیں۔اس رجحان میں سرمایہ دارانہ نظام کا ابطال بھی مادیت پسندی کے وجود میں شامل ہوجاتا ہے کیونکہ سرمایہ داری سرمایہ داروں کا طبقہ پیدا کرتی ہے جبکہ جدیدیت ارادے اور نیت کی پختگی کے ساتھ درمیانے طبقے کی نمائندہ ہوتی ہے۔ادب اور فنونِ لطیفہ اسی خاص حدودوقیود کے واضح احساس کے ساتھ معیشت، معاشرت اور ثقافت کو ایک اکائی کے طورپر منعکس کرتے ہیں۔ان جدت پسندوں میں سے ہر کوئی تو نہیں مگر کوئی کوئی اچھے برے کے درمیان تفریق کے قابل ہوتا ہے۔

مختلف اردو نقاد جدیدیت کی تعریف کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

آل احمد سرور جدیدیت کے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> جدیدیت صرف انسان کی تنہائی یا مایوسی، اس کی اعصاب زدگی کی داستان نہیں ہے اس میں انسان کی عظمت کے ترانے بھی ہیں۔اس میں فرد اور سماج کے رشتے کو بھی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔اس میں انسان دوستی کا ایک جذبہ بھی ہے مگر جدیدیت کا نمایاں روپ آئیڈیالوجی سے بیزاری، فرد پر توجہ اس کی نفسیات کی تحقیق، ذات کا عرفان اس کی تنہائی اور اس کی موت کے تصور سے خاصی دلچسپ ہیں۔[1]

لطف الرحمن جدیدیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> جدیدیت لفظ جدید سے مشتق ایک ادبی اصطلاح ہے جس نے ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد اردو میں ایک ہمہ گیر ادبی تحریک کی حیثیت حاصل کی۔ترقی پسند تحریک کی سرمایہ دارانہ جبر و استحصال کے خلاف ایک اجتمائی بغاوت تھی۔جدیدیت سماج اور میناکی جبریت کے خلاف ایک باغیانہ رد عمل ہے۔جدیدیت فرد کی داخلی جلاوطنی، موضوعی بے پناہی کی ترجمانی و تنقید ہے جس کے نتیجے میں فرد تنہائی الجھن، بیگانگی، اجنبیت، اکیلا پن، کلبیت، بوریت، یکسانیت، بے معنویت، مملیت، جرم، بے خوفی، بے سمتی، بے یقینی، نا اُمیدی، بیتابی، اکتاہٹ، بیزاری اور مفلسی کی کیفیت سے دور چار ہے۔ان رجحانات کے اعتبار سے جدیدیت فلسفہ وجودیت کی توسیع ہے۔[2]

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدیدیت ایک تاریخی، فلسفیانہ، سماجی، تہذیبی اور ادبی تصور کی حیثیت رکھتی ہے۔اس میں صرف انسان کی تنہائی، مایوسی اور اس کی اعصابِ زندگی کی داستان نہیں ہے بلکہ اس میں انسان کی عظمت کے ترانے بھی شامل ہیں۔اس میں فرد اور سماج کے رشتے کو بھی

بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے اور انسان دوستی کا جذبہ بھی ہے۔ مگر جدیدیت کا نمایاں روپ آئیڈیالوجی سے بیزاری، فرد پر توجہ، اس کی نفسیات کی تحقیق، ذات کے عرفان، اس کی تنہائی اور اس کی موت کے تصور سے خاص دلچسپی رکھتا ہے۔

جہاں انسان نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت فطرت کو تسخیر کرنے کی کوشش کی ہے وہاں وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا غلام بن کر رہ گیا ہے جس وجہ سے جدید انسان اپنی زندگی کے وسیع تر مفہوم کو سمجھنے سے عاری نظر آتا ہے۔ اس کا اپنے ماضی سے رشتہ منقطع ہو چکا ہے اور اس کا مستقبل ٹیکنالوجی کے بعض خطرات کی زد میں ہے کیونکہ جدید ٹیکنالوجی اس کے لیے نت نئے مسائل پیدا کر رہی ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر چکا ہے کیونکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسانی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کا سامان مہیا کیا ہے۔

انسانی تاریخ کے ابھی تک جتنے ادوار گزرے ہیں اگر ان کا عہد جدید میں موازنہ کیا جائے تو باآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ عہد حاضر کے انسان کی زندگی میں پہلے دور کے انسان کی نسبت سہولیات اور آسائشیں بہت زیادہ ہیں۔ ایسا کسی ایک شعبے میں نہیں ہے بلکہ زندگی کے جس شعبے پر نظر دوڑائیں انسان ترقی کی بلندی پر پہنچ چکا ہے۔ اس لحاظ سے عہد جدید کے انسان کو خوش قسمت تصور کرنا چاہیے لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ واقعی عہد جدید کا انسان اپنی اس ترقی سے کس حد تک مطمئن ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کا انسان زیادہ پریشان ہے۔ وہ مسلسل اداس رہتا ہے۔ بے چین رہتا ہے۔ تنہائی کا احساس اسے اندر سے دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔۔ خوف کے سائے ہر وقت اس کے سر پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ ایک وحشت ہے کہ تواتر کے ساتھ اُس کی جان کو لگی رہتی ہے۔ ایک افسردگی ہے کہ مسلسل اُس کی ہمت اور حوصلے کو اندر ہی اندر سے ختم کر رہی ہے۔ رنج کی ایک آکاس بیل ہے کہ اُس کے وجود سے لپٹی ہوئی پھیلتی چلی جاتی ہے۔ اس کی روح بے یقینی کے پہاڑ تلے دبی جا رہی ہے۔ اجنبی آوازوں، دل شکن واہموں اور جان لیوا وسوسوں نے اسے پژمردہ کر دیا ہے، اُسے کھانے کو کیا کیا میسر ہے، لیکن طبیعت جیسے کسی طرح کھانے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس بھی ہو جاتا ہے، یہ کہ کھاتا ہے، کھائے چلا جاتا ہے، لیکن بھوک مٹتی ہی نہیں۔ جسم میں توانائی کا احساس ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تادیر اور پرسکون ماحول کی نیند کے باوجود یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے سویا ہی نہیں یا گھڑی بھر کے بعد ہی کچی نیند سے جاگ اٹھا ہے۔ طبیعت میں بشاشت ہے نہ ہی دل میں امنگ۔ ایک مسلسل تھکن اور بیزاری کا نام ہے گویا زندگی۔ آخر کیوں؟

پریشانی اور خوف کی بات یہ ہے کہ ڈپریشن کی اس کیفیت میں انسان نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی نقصان کا باعث بنتا ہے۔ڈپریشن کا شکار نہ صرف اپنی زندگی ختم کر لیتا ہے بلکہ وہ اپنے گرد کے لوگوں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ صورت حال دنیا کے تمام ممالک میں ہے۔ مثلاً ایک شخص بلا جواز بازار میں خریداری کرتے ہوئے لوگوں پر گولیاں برسانی شروع کر دیتا ہے۔اپنی زندگی ختم کرنے سے پہلے بہت سے لوگوں کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔

مبین احمد اپنے ایک طویل مضمون "عہد جدید اور انسانی احساس کی صورت گری میں مارٹن لنگز کی کتاب *Modern Beliefs and Ancient Superstitions* سے حوالہ نقل کرتے ہیں۔مارٹن لنگز کے مطابق اگر موجودہ انسانی معاشرے کو پرانے معاشرے کے انسان کی زندگی کے تقابل میں دیکھا جائے تو پہلے انسان کے پاس یقین کی طاقت تھی۔ یہ طاقت اسے اعتقاد اور ایمان نے دی تھی۔مارٹن لنگز کے مطابق ایمان محض ایک مجرد اصطلاح نہیں ہے بلکہ یہ ایک ٹھوس عملی زندگی کا نام ہے۔یقین کی محرومی سے جدید انسان واہموں، اندیشوں اور الجھنوں میں گھر کر رہ گیا ہے۔ان سے بچنے کے لیے وہ وقتی ضرورتوں، مادی اشیا اور آسائشوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔کچھ دیر کے لیے اسے امان مل بھی جاتی ہے۔حاصل اور لاحاصل کی کیفیت کی وجہ سے وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے اور خود کو بے بس محسوس کرتا ہے۔روایتی معاشرے کے انسان کے پاس جو ایمان کی قوت تھی جس سے وہ پر سکون تھا۔آج وہ اپنے ہاتھ سے اپنی تقدیر لکھنے پر قادر ہے مگر افسوس پھر بھی پریشان حال ہے۔[۳]

جدید دور کا انسان ترقی کی معراج پر پہنچنے کے باوجود درج ذیل مسائل کا سامنا کر رہا ہے۔

کرب:

جدید انسان کرب میں مبتلا رہتا ہے۔کرب کی کیفیت سے گزرنا اس کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔انسان میں کرب کی کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کا انسانیت سے اعتبار اٹھ جاتا ہے اور وہ اپنی صلاحیتوں سے بد گمان ہو جاتا ہے۔اس صورت میں اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا اور اسے ہر طرف پریشانی ہی پریشانی نظر آتی ہے۔اسے چپ سی لگ جاتی ہے کیونکہ اسے کوئی سننے والا اور اس کی حالت سمجھنے والا نہیں ہوتا۔اس کی روح پر زخم لگتے ہیں یوں وہ کرب کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔

مایوسی:

جدید دور کا انسان مستقبل کے بارے میں فکر مند رہتا ہے اور خاص امیدوں اور توقعات کے سہارے فیصلے نہیں کرتا کیونکہ امکانات کی موجودگی میں فیصلہ کرنا اور اس کی ذمہ داری قبول کرنا اس کی مجبوری ہے۔ مستقبل تاریکی

میں ہوتا ہے اور اس تاریک صورت حال میں جب نتائج کا اندازہ نہیں ہوتا تو انسان پر مایوسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ بعض اوقات کسی مطلوبہ عمل کا نتیجہ سامنے نہ آنے پر بھی انسان میں مایوسی پھیل جاتی ہے۔ مایوسی کے چند بڑے اسباب و محرکات میں ارادے کو پورا نہ ہو سکنا، دنیاوی زندگی کا غلط تصور اور انسانی کمزوریوں کا شدید تاثر ہیں۔

اکتاہٹ:

اکتاہٹ کا عمل کسی خارجی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ یہ انسان کی ایک داخلی کیفیت ہے جو اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے معمولات تبدیل کرے۔ دراصل ہر لمحہ انسان کو اپنے ادھورے پن اور نامکمل پن کا احساس رہتا ہے اور اسے تکمیل ذات اپنے آپ سے بہت دور محسوس ہوتی ہے یوں وہ خوب سے خوب تر کا متلاشی ہوتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں اسے مسلسل جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ تو اس لیے وہ ہر لمحہ اکتاہٹ کا شکار بھی ہوتا ہے۔

نفرت:

نفرت ایک منفی جذبہ ہے جس کی وجہ باغیانہ جذبات ہوتے ہیں۔ یہ جذبات کسی شخص، ملک، مذہب، نظریے، عقیدے اور سوچ کے خلاف ہو سکتے ہیں۔ نفرت کی موجودگی اکثر غصے، اطراف کے ماحول یا کثرت سے تعلق میں آنے والے لوگوں سے دل برداشتہ ہونے یا رویے یا طرز عمل کے استعمال سے جڑی ہے۔ بعض اوقات انسان اس نفرت کی وجہ سے اندھا ہو جاتا ہے اور اس کی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ نفرت کی وجہ سے انسان حقائق سے دور ہو جاتا ہے۔

داخلی کشمکش:

عصر حاضر کا انسان جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے نت نئی ایجادات کر رہا ہے اور ترقی کی منازل طے کرتا جا رہا ہے جن سے وہ استفادہ ضرور کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ داخلی کشمکش کا شکار رہتا ہے۔ ہر انسان کے اندر منفی اور مثبت جذبات ہوتے ہیں جن کا اظہار انسان مختلف صورتوں میں کرتا ہے۔ ماحول کی ابتری اور خراب حالات بھی انسان کو داخلی کشمکش کی کیفیت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ داخلی کشمکش میں مبتلا انسان اپنے اندرونی جذبات و احساسات کو اہمیت دیتے ہیں جبکہ ان کے گردونواح میں حالات اس کے برعکس ہوتے ہیں۔

اضطراب:

اضطراب ایک تکلیف دہ جذباتی کیفیت ہے جس سے آج کا انسان دوچار ہے۔ اضطراب کا شکار انسان ہر وقت پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔ کسی کام میں اس کا دل نہیں لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دنیا اسے بے معنی لگتی ہے۔ اگر

اضطرب کی یہ کیفیت جلدی ختم نہ ہو تو اس کے انسانی ذہن اور جسم پر بہت برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔اضطراب کی کیفیت سے چھٹکارا پانے کے لیے انسان اپنے فیصلے خود کرے۔

اجنبیت/تنہائی:

اجنبیت اور تنہائی کا احساس تو اس کو ہوتا ہے جو اپنے معاشرے کی اور زمانے کی برائیوں کو دیکھتا ہے اسے محسوس کرتا ہے اور پھر اس سے اجتناب کر کے پھر تنہا رہ جاتا ہے۔اور یہی اجتناب اور احساس تنہائی اپنے ماحول سے اپنی دنیا سے کھینچ کر اسے اس کی طرف لے جاتا ہے جس کی وہ پرستش کرتا ہے جہاں اس کے احساسات کو سکوں ملتا ہے وہ جگہ جو اس کے لیے مناسب ہے۔وہ منزل جو اس کی شخصیت کے لائق ہے۔۔یہی احساس روح کے کامل ہونے کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے شدید سے شدید تر ہوجاتا ہے۔اور اس اعتبار سے تکلیف میں اضافہ ہو جاتا ہے۔انسان کے لیے سب سے دردناک چیز (وہ انسان جو بلندیوں تک پہنچ چکا ہے) تنہائی ہے۔

شناخت:

انسان اپنی منفرد شناخت ہوتا اور دنیا کی بھی۔وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور دنیا کو اس سے بھی زیادہ پہچانے۔انسان اپنی ذات کا متلاشی ہونے کے ساتھ ساتھ کائنات کے رموز و اسرار سے بھی واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔مذہب سے دوری کی وجہ سے جدید انسان لادین ہوتا جارہا ہے جس کی وجہ سے اس کی اپنی ذات اور شناخت کہیں گم ہوتی جارہی ہے۔

باب اول میں احتشام علی کی کتاب جدید اردو نظم میں عصری حسیت سے نظری خاکہ تشکیل دیا گیا ہے جس کے چار نکات میں سے ایک " عصری حسیت کے تناظر میں جدید انسان کا تصور " ہے۔اس نکتے کی رو سے ہم آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں جدید انسان کے مسائل و مصائب اور اس کی عصر حاضر کی کیفیات کا تجزیہ کریں گے۔

" طلسم بے اسم " میں آفتاب اقبال شمیم اپنے فکری منظر نامے کو شاعرانہ تخیل کے وسیع کینوس پر بکھیرتے ہیں۔عصر حاضر کا انسان داخلی کرب میں مبتلا ہے جو اسے گرد و نواح کی دنیا سے ملتا ہے۔یہ کرب اسے چین نہیں لینے دیتا۔اس کے کرب کی وجہ اس کا اکیلا پن ہے۔انسان ناشناسا سے ہجوم کے تعاقب میں ہے۔انسان اپنے تخیل سے کچھ ایسی صورتیں گڑھ لیتا ہے جسے وہ ہر تلاش کرتا ہے۔جدید انسان ایسے خواب دیکھتا ہے کہ شاید جس کی تعبیر ہمارے مادی سماج میں ممکن نہیں ہوتی۔اس کے یہ خواب جو دراصل اس کی خواہشات نفس ہیں وہ ان کے پیچھے اندھا دھند بھاگتا

ہے۔جب اسے اپنے خوابوں کی تعبیر نہیں ملتی تو وہ ذہنی کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔آج کے انسان کے سامنے ظاہر و باطن کی دنیاؤں میں ہر طرف بدلتی شکلیں،لاتعلق صورتیں اور بے حس رشتے ہیں۔بقول آفتاب اقبال شمیم:

حرف بے اظہار کی مانند سوچا تھا
مگر دیکھا نہ تھا
جس کی چاہت میں نگاہیں
رنگ وصوت جسم وجاں کو جمع کر کے
(اور غیر آسودہ ہو کر)
منتشر کرتی رہیں
اور میں ناقابل تعبیر خوابوں کے خرابے میں
خجل ہوتا رہا[۴]

"کایا کا کرب" میں آفتاب اقبال شمیم کی ایسی نظم ہے جس میں وہ جدید انسان کی تنہائی کے کرب کو بیان کرتے ہیں۔کرب و تنہائی کے لمحے انسان کے لیے بہت اذیت ناک ہوتے ہیں کیونکہ وہ اس کیفیت میں چپ سادھ لیتا ہے۔اس کی سوچوں پر ایسا کرب حاوی ہے کہ وہ اپنی ہی آنکھوں کی عدالت میں اپنی بے بسی کا تماشا دیکھ رہا ہے۔وہ اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی قید میں ہے۔گناہ انسان کو داخلی کرب میں مبتلا رکھتا ہے۔وہ اپنے ان گناہوں کی دنیا سے باہر آنا چاہتا ہے مگر جدید زمانے کے بے حسی اسے اس حصار سے باہر نکلنے نہیں دیتی۔بے بسی ایک ایسی اذیت ناک حالت ہوتی ہے جس میں انسان مسلسل گھٹن کا شکار رہتا ہے اور اسے اپنے اردو گرد پھیلی دنیا کی رنگینی زہر محسوس ہوتی ہے۔انسان اپنی بے بسی کے عالم میں زندگی کی تاریک راہوں کا پر چل پڑتا ہے۔وہ اپنی من کی دنیا میں چیخ و پکار اور التجائیں کرتا ہے کہ مجھے اس قید سے نکالیں مگر اس کو کوئی سننے والا نہیں۔پھر انسان اسی کرب کی اذیت میں سسک سسک کر زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔آفتاب اقبال شمیم اس کرب کی حالت کو یوں بیان کرتے ہیں:

اس نے دیکھا
وہ اکیلا اپنی آنکھوں کی عدالت میں
کھڑا تھا
بے کشش اوقات میں بانٹی ہوئی صدیاں
کسی جلاد کے قدموں کی آوازیں مسلسل

سن رہی تھی
آنے والے موسموں کے نوحہ گر مدت سے
اپنی بے بسی کا زہر پی کر
مر چکے تھے[5]

آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم "نیلی گرد کا زمزم" میں نئے زمانے کے مسلسل بہاؤ کا ذکر کرتے ہیں کی انسان وقت کے ساتھ ساتھ عمر کی منازل طے کرتا جارہا ہے۔اس پر نیستی کا خوف طاری ہے۔یہ ساری صورت حال انسان کو زندگی کے لایعنی اور لاحاصلی کا احساس دلانے کا سبب بنتی ہے اور پوری زندگی موت کے خوف میں گزار دیتا ہے۔ گویا اس کے لیے زندگی ایک وہم بن کر رہ گئی ہو۔لایعنیت کا رویہ ایک غالب ذہنی رویہ ہے۔لایعنیت کی کیفیت ہر وقت انسان پر طاری رہتی ہے۔انسان ایک مسلسل وہم بھری زندگی گزارتا ہے جس کی دنیا میں کوئی منزل نظر نہیں آتی۔اپنے نہ ہونے کا احساس اسے لایعنیت کے واہمے کے حصار سے نکلنے نہیں دیتا۔وہ ہمیشہ سوچتا رہتا ہے کہ اسے آگے کہاں جانا ہے اور طویل فاصلوں کی یہ تھکن اسے افسردہ بنا دیتی ہے۔ نیستی کا خوف اسے دنیا کی رنگینوں سے دور کرتا جارہا ہے۔ نظم سے حوالہ:

آؤ آؤ
میں اکیلا اپنے سناٹے میں، گرد و پیش کے آشوب میں کھویا ہوا
چل رہا ہوں
راستے کے سنگریزے چنتے ہوئے
تاکہ پتھرائی ہوئی صرصر کی سڑکیں، رفتہ رفتہ میرے پاؤں چاٹ لیں
چل رہا ہوں
جانے کس جانب مجھے جانا ہے، کیوں جانا ہے
شاید فاصلوں کی انتہا افتادگی ہے[6]

"خود کلامی کے کٹہرے میں" میں آفتاب اقبال شمیم نے ایسے جدید انسان کا تصور دیا ہے جو اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑا اپنے مصائب و مسائل کا جواز تلاش کر رہا ہے۔ عصر حاضر کا انسان عجیب داخلی کشمکش میں مبتلا ہے۔وہ نئی تبدیلیوں کی یلغار کی وجہ مختلف اندیشوں میں گرفتار ہے۔سائنس اور ٹیکنالوجی نے جہاں انسان کی زندگی کو پر آسائش بنا دیا ہے وہاں اس کے لیے بہت سے مسائل کو جنم دیا ہے۔وقت کا مسیحا نہایت مشفقانہ اور درد بھرے لہجے میں

جدید انسان کو وقتی مصائب پر صبر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ شاعر پر امید بھی ہے کہ وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ اگر آج مسائل ہیں تو مستقبل ان کے حل کی امید ہے۔

شاعر جب دوبارہ زمانے کے بدلتے رخوں کو دیکھتا ہے تو پھر سوچتا ہے کہ اگر انسان کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انسان اس وسیع کائنات میں سانس کے لمحوں میں مقید ہے۔ انسان تو بے بس ہے۔ اس کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی زندگی یا موت کے لمحوں پر قادر نہیں تو پھر وہ شدت احساس سے اسے کیا حاصل ہو گا۔ جدید انسان کا یہ المیہ ہے کہ وہ مستقبل کے سپنے دیکھتا ہے اور ان اپنی لامحدود خواہشات کے حصول کے لیے حال میں مستقبل کے خواب سجاتا ہے۔ انسان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ترقی کے باوجود بہت سے معاملات میں بے بس ہے۔ اس کی یہ بے بسی ہی اسے سکون سے جینے نہیں دیتی۔ انسان کی پیدائش کے ساتھ دکھوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اس لیے انسان خود کو اپنی عدالت میں جزا یا سزا کے لیے پیش نہ کرے۔ بقول شاعر:

تو پھر اپنی حسوں میں
بے سبب ہیجان پیدا کر کے کیا لو گے
سنو! اس چشم کم بینا سے ایسی دوریوں کو دیکھنے کی
خواہشیں اچھی نہیں ہوتیں
عجب بے اعتدالی ہے تصور کی
کسی نایافتہ جنت کی سپنے دیکھتے رہنا
یہ سایہ جو تمہیں آزاد لگتا ہے
ہمیشہ دھوپ کے ہمراہ آتا ہے
جنم کے ساتھ وابستہ ہیں سارے سلسلے غم کے
نہ دو خود کو یہ ایذا، یہ سزا
بے اطمینانی کی[۷]

آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم "منکروں کے درمیان" میں عصر حاضر کے انسان کی اضطراب کی کیفیات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ یہ انسان خوف زدہ ہے کہ کہیں جدید زمانے کی چکاچوند روشنیوں کا اثر مجھ سے میری سچ بولنے کی صلاحیت نہ چھین لے۔ دولت کے پجاریوں کی طرح کہیں مجھ پر بھی حرص اور طمع کا سحر طاری نہ ہو جائے۔ جدید تہذیب کا ہر شہر اپنی روایات کو چھوڑ کر مال وزر کی دنیا میں گم ہو گیا ہے۔ آج کا انسان جدیدہ تہذیب کا پروردہ ہے۔ جدید

تہذیب نے اس پر شناخت کی مہر ثبت کر دی ہے اور انسان کو جغرافیوں اور علاقوں کی حدود تک محدود کر دیا ہے جب کہ انسان آزاد پیدا ہوا اور آزاد رہنا چاہتا ہے۔ اس دنیا میں اس کے پاس اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کا اختیار ہے۔ آج اگر اسے اپنی منشا کے مطابق جینے کا اختیار دیا جائے تو مستقبل میں جو نئے شہر آباد کریں گے وہ اس خوف سے آزاد ہوں گے کہ انہیں ہر طرح سے زندگی جینے کا اختیار ہو گا۔ بقول شاعر:

مضطرب ذات کہیں
سچ کا تعویذ اتارے نہ میرے بازو سے
اور میں تیرے فسوں میں آ کر
اسم زر پھونکتی آواز کے ہمراہ چلوں
(شہر کا شہر رواں ہے جیسے)
اپنے انکار کی مدہوشیوں کے دائرے میں[8]

نظم "اپنے ہونے کی سزا" میں آفتاب شمیم اقبال جدید انسان کے منفرد وجود کی عکاسی کرتے ہیں۔ انسان ماضی میں بھی اکیلے پن اور تنہائی کا شکار تھا اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے آج بھی تنہا ہے۔ صنعتی ترقی نے جہاں اسے پر آسائش زندگی فراہم کی وہاں اسے اپنی اس آسائش کی قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔ اس کی ذات اجتماعیت کی گردشوں میں گم ہو گئی۔ یوں جدید انسان کرب کا شکار ہوا۔ زید جو اس نظم کا کردار ہے وہ اپنی ذات میں گم ہو جانا اور اپنے ہی تخیل کے تشدد کا شکار ہو جانا تو منظور کرتا ہے لیکن وہ جبر کے کسی قلعے یا عقائد کی کسی زنجیر میں قید ہونا نہیں چاہتا۔ وہ بے مشروط آزادی چاہتا ہے۔ ایسی آزادی جو چاہے ایک لمحے کے لیے ہو لیکن صرف اس کی اپنی ہو۔

اپنے ہونے کی سزا
کل بھی تھا وہ اجنبی لوگوں میں تنہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بے رفیق
مرد و زن ترشے ہوئے شیشوں کی آنکھوں سے اسے
دیکھتے تھے اور نفریں قہقہے سے
پھر لیتے تھے نظر[9]

جدید انسان کے سامنے جبریت کی بہت سی مثالیں ہیں۔ انسان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اجنبی لوگوں کے درمیان ہو۔ اس کے دل ہمیشہ مضطرب اور بے چین رہتا ہے۔ وہ اپنی معمول کی زندگی سے بھی تنگ آ چکا ہے۔ وہ آزادی چاہتا ہے اور مشرق اور مغرب کی حدود بندی کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ خود ستائشی کی وجہ سے انسان میں بصیرت

ختم ہو چکی ہے۔ ہر طرف سے خوف اور اندیشوں نے اسے جکڑ لیا ہے۔ وہ ان سے چھٹکارا چاہتا ہے تا کہ اسے دائمی سکون نصیب ہو۔

"نہیں اور ہاں سے آگے" نظم میں آفتاب اقبال شمیم نے جدید انسان کے تصور کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آج کے انسان کی خواہشات کی کوئی انتہا نہیں ہے وہ ایسی چیزوں کی جستجو میں رہتا ہے جو اس کے رسائی سے باہر ہیں۔ وہ اپنی جستجوؤں کو اپنے جذبات واحساسات کے تصور میں دیکھتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اسباب دنیا اس کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ جس دنیا میں وہ اپنی ذات کا متلاشی ہے۔ وقت کی اس رفتار میں اسے وقت کے ساتھ بھاگنا پڑتا ہے ۔انسان کو اپنی بقا کی جنگ خود ہی لڑنی پڑتی ہے۔ وقت اس کی بقا کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب کسی صحرا میں تیز آندیاں چلتی ہیں تو وہ خود رو پودوں کو جڑ سے اکھاڑ دیتی ہیں۔ بالکل ایسے ہی انسان کی اندر کی دنیا میں ہوتا ہے۔ تہذیب اور جذبے انسان کو خود کو سزا دینے پر اکساتے ہیں۔ انسان اپنی تہذیب اور جذبوں کا خود غلام بن جاتا ہے۔

آفتاب اقبال شمیم نے اس نظم میں جدید انسان کے داخلی اور خارجی ہر دو حوالوں سے منظر کشی کی ہے۔ یہ نظم المناک واقعات پر تحریر کی گئی ہے۔ انسان پر اس صدی کے جو انکشافات ہوئے ہیں اس سے اس کے رومانوی رویے زوال پذیر ہو گئے ہیں۔ عالمی سطح پر مشرق اور مغرب کا فلسفہ انسان ہماری اجتماعی میراث ہے۔ انسان نے صدیوں کے طویل عرصے میں انسانی تہذیب کی جو بھی نقاشی کی اس سے ایک شعور نے جنم لیا ہے کہ انسان کو نفسیاتی طور پر جغرافیوں اور خطوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

آفتاب اقبال شمیم نے نہیں اور ہاں سے آگے کے قاعدوں اور کلیوں سے ممکنات کی راہ کا متلاشی منظر نامہ پیش کیا ہے۔ زمین، فطرت اور زندگی کے ترتیب دیے ہوئے ان کلیوں اور انکشافات کے سارے منظر نامے میں انسان ایک مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ظاہری طور پر وہ اکیلا زندگی کے بے معنی سفر میں خود سے متصادم بھی ہے اور بالکل تنہا بھی۔ وہ آگے بھی نکل سکتا ہے اور خود کو اس مد بھیڑ میں گم بھی کر سکتا ہے۔ اپنے آپ سے ملا ہوا اور بچھڑا ہوا بھی ہے ۔مضطرب بھی ہے اور مطمئن بھی ہے۔ بقول آفتاب اقبال شمیم:

سوال اس سے نہ پوچھیں، اے تماشا گھر!
بتا اپنی بقا کی جنگ لڑتی خلقتیں
برفوں میں اگتی گھاس کی مانند
گاہے سبز گاہے زرد بہتے وقت میں
بہتی رہیں گی

انت کیا اس تماشے کا
ہوا کیوں دھوپ سے مل کر
کسی تعمیر کی خطر
زمیں پر بارشوں کی دھوم میں
جنگل اگاتی ہے
ہوا کیوں آندھیاں لاتی ہے
اپنے دشت پروردہ کو خود تخریب کا
ایندھن بناتی ہیں
اگر ہم اس بڑی پھیلی ہوئے فطرت کا کوئی انگ
خود کو مان لیتے ہیں
تو کیا اس نارسا، نامنکشف اندر کی دنیا میں
یہی ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ جذبے جو تہذیبیں بناتے ہیں
ہمیں خود کو سزا دینے پہ اکساتے ہیں
ہنگامے اٹھاتے ہیں[1]

آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم "ہجر زاد" میں جدید انسان کے دکھوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم کہتے ہیں کہ انسان دکھ کا عہد طویل ہے۔ دکھ ایک منفی جذبہ ہے جو ہر انسانی معاشرے میں اور ذی شعور اور ذی عقل انسان کو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر محسوس ضرور ہوتا ہے۔ یہ خوشی کی عین ضد ہوتا ہے۔ اس جذبے ایک تکلیف اور درد چھپا ہوتا ہے۔ یہ درد کئی وجوہ سے ممکن ہے۔ ایک دکھ تو کسی کی فوری ناکامی کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ دکھ کسی ناگہانی نقصان کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ دکھ انسان میں دماغی توازن کا خلل بھی پیدا کر سکتا ہے۔

جدید انسان کی تنہائی اس کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ وہ اپنے دکھوں کی روداد سنانے کے لیے اپنے ہی جیسے کسی انسان کی تلاش میں ہے جو اس کے اندر کی دکھ بھری داستان سنے اور وہ کچھ پر سکون ہو جائے۔ وہ اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے فریب بھرے معاشرے میں بھٹکتا رہتا ہے۔ معاشرے میں پھیلی اجنبیت کا احساس اس کی روح کو جنجھوڑتا ہے۔ جدید نسان میں خود اعتمادی کی کمی ہے وہ دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کو اپنے لیے سچ سمجھتا ہے۔ جب عصر

حاضر کا انسان اپنی تنہائی سے تنگ آجاتا ہے تو وہ لوگوں کے انبوہ میں چلا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے دکھوں سے وقتی فرار حاصل کر سکے لیکن ظاہر اور باطن کی دنیا کے پر فریب چہرے اس کی ذات کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کرتے چلے جاتے ہیں۔ عصر حاضر کا انسان جب اپنی مشابہتیں جب دوسروں میں تلاش کرنے لگتا ہے تو اس کی اپنی شناخت کہیں گم ہو جاتی ہے۔انسانی زندگی کی تلخ حقیقتیں اس کی زندگی اجیرن کر دیتی ہیں پھر اسے زندگی کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے سمجھوتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔وہ اپنے دکھوں سے فرار چاہتا ہے اور اس فرار سے وہ مزید الجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے۔دکھ بدل بدل کر آتے ہیں اور دکھوں کا طویل سلسلہ ختم ہونے کو نہیں آتا۔بقول آفتاب اقبال شمیم:

مرے دکھ کا عہد طویل ہے
مرا نام لوح فراق پر ہے لکھا ہوا
میں جنم جنم سے کسی میں عکس مشابہت کی تلاش میں
پھر اپنے خواب سراب ساتھ لیے ہوئے
گیا شہر شہر، نگر نگر
تھیں عجیب بستیاں راہ میں، میری جیت، میری شکست کی
کسی دوسرے کی صداقتیں۔۔۔۔۔۔۔میری رہبر، میری رہزن
لیے ساتھ ساتھ، قدم قدم
کبھی پیش خلوت آئینہ
کبھی صبح شام کی خلقتوں کے جلوس میں
کئی ظاہروں، کئی باطنوں کے بدلتے روپ میں منقسم مجھے کر گئیں [11]

آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم "المیے کے فالتو کردار" میں عصر حاضر کے انسان کے المیے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔المیہ کی تعریف ارسطو نے بوطیقا (Poetics) میں یوں کی ہے۔"المیہ نقل ہے ایک ایسے عمل کی جو سنجیدہ اور مکمل ہو۔ جس کی زبان ایسے وسائل سے مزین ہو جو اس کے مختلف حصوں میں نمایاں کیے گئے ہوں۔ جس کا طریقہ اظہار بیانیہ ہونے کی بجائے ڈرامائی ہو۔ اس کے واقعات خوف اور رحم کے جذبات اُبھاریں۔ اس طرح ان جذبات کی اصلاح کیتھارس (Catharsis) ہو جائے۔المیہ کی اصطلاح عمومی زندگی کے بطن سے پھوٹ کر ادب کی دنیا میں

داخل ہوئی ہے۔ ہر المیہ ایک نئی صورتِ حال کو جنم دیتا ہے۔انسانی زندگی ایک ڈرامہ ہے جس میں انسان کو بے شمار المیوں سے گزرنا پڑتا ہے اور ان المیوں سے گزرتے ہوئے وہ اضطراب کا شکار ہو جاتا ہے۔

اگر ہم عصر حاضر کے المیوں کے حوالے سے دیکھیں تو آج کے انسان کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح کچلا جارہا ہے۔ نا قاتل کا پتہ چلتا ہے اور نہ مقتول کا۔ موت کا خوف بھی جدید انسان کا المیہ ہے۔ وہ ڈر ڈر کے زندگی گزارتا ہے کہ کب اسے موت کی نیند سلا دیا جائے گا۔ "المیے کے فالتو کردار میں "آفتاب اقبال شمیم ملکی سطح پہ رونما ہونے والے سیاسی اور تاریخی واقعات اور حادثات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد رونما ہونے والے انتشار، افتراق ،اضطراب اور بے چینی کے حادثات سے انسان کی بے بسی اور کم مائیگی شاعری کا محبوب موضوع بن گیا۔ پاکستان کی تاریخ میں مارشل لا کے دور میں قتل و غارت کی گئی۔ لوگوں کو سر عام قتل کیا گیا۔ پاکستان کے وہ عام شہری اور شاعر و ادیب جو مارشل لا کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ آمروں کا مقصد کسی بھی قیمت پر مزاحمت کو روکنا تھا اور اس مقصد کے لیے انقلابیوں کے سروں کی قیمت وصول کی گئی تا کہ آمرانہ نظام حکومت چلتا رہے۔ بقول شاعر:

اور وہ کیا! المیے کے فالتو کردار تھے؟
شہر کی چوکوں میں
جن کا شوق وارفتہ لہو اور آگ کی تحریر میں
اپنی گواہی دے گیا
اور وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
ٹکٹکی پر جن کے چمکیلے بدن داغے گئے
اور وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔[۱۲]

نظم "آس پاس" میں آفتاب اقبال شمیم جدید انسان کے تصور پر روشنی ڈالتے ہیں کہ عہد حاضر کا انسان جو کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا پروردہ ہے ہر وقت اضطراب کی کیفیت میں رہتا ہے۔ حساس دل رکھنے والے باضمیر شاعر جب اپنے ارد گرد مصائب، مشکلات، ظلم و ستم، ناانصافی اور غربت کے المناک مناظر دیکھتے ہیں تو ان کا دل کڑھتا ہے اور آفتاب اقبال شمیم جیسے شاعر جدید انسان کے ان کرب ناک منظر ناموں کو اپنے تخیل کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ انسان اپنی قسمت کے ہاتھوں میں پتلی بن کر ناچتا ہے اور قسمت کے تھپیڑوں کے سامنے بے بس ہے۔ آج کا انسان ہر وقت اپنی قسمت سے گلے شکوے کرتا رہتا ہے۔ گلے شکوے کرتے کرتے اس کی عمر گزر

جاتی ہے کیونکہ وہ ہر وقت اپنی قسمت سے نالاں رہتا ہے۔ یہ گلے شکوے اس کی داخلی کیفیات کا نتیجہ ہوتے ہیں جو اس کی لاحاصلی سے جنم لیتے ہیں۔

انسان جب خواب دیکھتا ہے تو پھر ان کی تعبیر میں سر گرداں رہتا ہے۔ انسان دوسروں پر حکومت کے خواب دیکھتا ہے۔ ترقی اور خوشحالی کے خواب دیکھتا ہے۔ امن و آشتی کے خواب دیکھتا ہے۔ مثالی زندگی کے خواب دیکھتا ہے ۔لاحاصل کو حاصل کرنے کے خواب دیکھتا ہے۔ شاہانہ زندگی گزارنے کے خواب دیکھتا ہے۔ آزاد زندگی کے خواب دیکھتا ہے۔ ان خوابوں کے حصول کے لیے وہ دن رات محنت کرتا ہے اور دشوار کن مرحلوں سے گزرتا ہے جس سے وہ اپنی ذات سے غافل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے وقت نہیں کہ اپنی پریشانیوں اور دکھوں کے بارے میں کسی کو بتا سکے۔ خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کے اس چکر اس کی زندگی کی شام ڈھل جاتی ہے اور سکون کے جزیروں میں پہنچ جاتا ہے بقول آفتاب اقبال شمیم:

آخر تم نے
میرے لیکھ میں میرے بھید کا مجھ پر
کم کم کھلنا کیوں لکھا تھا!
کیسے دن تھے
خواب میں اپنی تخت نشینی کا منظر جب دیکھا تھا
دودھ کا امرت پیار کا بوسہ
خوشبو کے کیسے جھونکے تھے، جن کے لمس سے لمس ملا کر
دھوپ میں شعلے کی کیفیت جاگی تھی
اور مجھے چاروں جانب کے آئینوں کی دنیا میں
تنہائی کا، کثرت کا دلچسپ تماشا
خود ہی منظر خود ہی ناظر بن کر اپنے راج نگر میں
تکنا تھا[۱۳]

"روشنی نا روشنی" میں آفتاب اقبال شمیم معاشرے میں پھیلتی بے حسی، بے یقینی، ناآسودگی اور سمجھوتے کو موضوع بنایا ہے۔ جب معاشرے میں انصاف نہیں ہوتا تو بے یقینی اور بے حسی کی فضا جنم لیتی ہے۔ جدید مشینی دور میں معاشرے میں اجنبیت اور تنہائی کو فروغ دیا ہے۔ معاشرے میں ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے۔ جدید انسانی معاشرہ

اخلاقیات سے عاری ہوتا جارہا ہے۔پرانی قدریں دم توڑ رہی ہیں۔انسان کو زندگی کی گاڑی کو چلانے کے لیے ناچاہتے ہوئے بھی بہت سے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں اسی وجہ سے وہ داخلی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔آج کا انسان خوابوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک چکا ہے۔ نظم سے حوالہ:

سارے رنگ ادھورے ہیں
سب خوشبوئیں
میرے مشام ذوق کو ترسایا ترسیار کھتی ہیں
آنکھوں کی اس ناآسودہ بستی میں
روشنیوں نارو شنیوں کی آپس میں یکجہتی ہے
دھوپ ہمیشہ سائے سے سمجھوتا کر کے رہتی ہے [۱۴]

آفتاب اقبال شمیم جدید دور کے نباض ہیں۔انھوں نے معاشرے کو ہر پہلو اور ہر زاویے سے دیکھا ہے۔ان کی ایک نظم "دو چہرے۔۔۔ایک چہرہ" میں انسان اپنی ذات کو لغویت کا شکار محسوس کرتا ہ اور کبھی اسے پورے معاشرے کے لوگ نیم فہمیدہ مقاصد کی تگ ودو میں مصروف نظر آتے ہیں۔ جس طرح انسان خود اپنے جوش عمل کے حوالے سے اپنی ہستی کا ثبوت چاہتا ہے اور جدوجہد سے خوشی حاصل کرتا ہے۔اسی طرح وہ چاہتا ہے کہ معاشرہ بھی اپنی جدوجہد کے حوالے سے مصدقہ رویوں کو اپنائے اور انسان کی ترقی کے لیے سہولیات فراہم کرے۔ نظم سے حوالہ:

دن کے دورانیے میں
ایک بے لیکھ جواری کی طرح
ہار دیتے ہو کمایا ہوا دھن خوابوں کا
پاؤں کے گرد تھکن بن کے لپٹتے ہوئے اس رستے پر
نیم فہمیدہ مقاصد کی تگ ودو میں رواں رہتے ہو
ایک موہوم سے وعدے کے تعاقب میں سدا [۱۵]

آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم "یک شہر زرد رو" میں اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آج کا انسان مایوس اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہے۔جدید معاشرے میں یہ خیال پختہ ہو چکا ہے کہ دولت ہی اصل طاقت ہے ۔دولت کا لالچ انسان کو انسان نہیں رہنے دیتا دوسری طرف غربت کی چکی میں پستا ہوا نادار انسان۔معاشرے میں کچھ

ایسے افراد کا گروہ ہوتا ہے جو مجبوروں کو ظلم سہنے کا عادی بناتا ہے۔ جدید عہد کا انسان زوال کا شکار ہو رہا ہے کیونکہ اس کی اخلاقی قدریں دم توڑ رہی ہیں۔ انسان بے ضمیر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے سامنے ظلم ہوتا ہے مگر وہ خاموش رہتا ہے۔ انسان کی اس بے حسی سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس میں انسانیت ختم ہو گئی ہو۔ عصر حاضر کے انسان نے اپنی قدروں کو پامال کر لیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں کوئی ہاتف نہیں کہ آنے والے کل کے راز کو آشکار کروں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا شعری تخیل اس قابل نہیں ہے کہ میں اپنی شاعری کا بیانیے میں سچ کا اظہار کروں کیونکہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ بقول آفتاب اقبال شمیم:

کہ سارے لفظوں نے اپنے معنی بدل لیے ہیں
میں کوئی ہاتف نہیں کہ فردا کا بھید کھولوں
مجھے یہ احساس ہے کہ یوں بھی
میرا سخن معتبر نہیں ہے
میں اپنے سچ کو کہاں پہ تولوں
کہ ساری بستی میں رہ گئی ہے
اس ایک میزان زر گروں کی [۱۷]

"الف اول الف آخر" میں آفتاب اقبال شمیم میں جدید معاشرے کی زندگی کو موضوع بنایا ہے جس میں انسان خوف و ہراس کی حالت میں محصور ہے۔ ایک ہجوم بھرا معاشرہ ہے جہاں پہ نادر اطبقے سے ناانصافی ہو رہی ہے۔ ہر طرف بے حسی پھیلی ہوئی ہے۔ نادار اور غریب لوگوں کی فریاد سننے والا کوئی نہیں ہے۔ معاشرے میں قانون کی بالا دستی نہیں ہے۔ طبقاتی تقسیم نے معاشرتی ناہمواریوں کو جنم دیا ہے جس سے معاشرے میں بے بسی اور مایوسی کی فضا پیدا ہوئی ہے۔ آفتاب اقبال شمیم نے اس نظم میں معاشرے میں بکھرے حقائق کی بھرپور منظر کشی کی ہے۔ مکرو فریب، ریاکاری اور منافقت نے انسانی رشتوں میں دراڑیں ڈال دی ہیں جس سے معاشرتی قدریں دم توڑتی محسوس ہوتی ہیں۔ نظم سے اس کا حوالہ:

انائیں زندگی کرتی ہیں کن حیلوں، وسیلوں سے
افادے، فائدے، کمزور لوگوں کی دعائیں، التجائیں
قاعدے قانون، صرف و نحو میں میں ناپے ہوئے رشتے عمل
اوقات، خالی اور خلا کو شور سے بھرنے کی ترکیبیں

ذرا ان منحنی شکلوں
کے کبڑے پن کو سیدھا کر کے دیکھو تو
الف اول الف آخر[17]

نظم " مگر میرا سوال ہے !" میں آفتاب اقبال شمیم جدید انسانی معاشرے کی روایات اور تہذیب و تمدن کو موضوع بنایا ہے۔اس نظم میں وہ جدید تہذیب سے پیدا ہونے والی صورت حال کو ایک ڈرامائی منظر میں پیش کیا ہے ۔ان کے خیال میں جدید تہذیب میں کچھ ایسے عناصر شامل ہو گئے ہیں جو اس تہذیب کی زوال پذیری کی وجہ بن گئے ہیں۔یہ نظم تہذیبی شناخت کی گمشدگی کا نوحہ ہے۔میں اور ناکامی اس نظم کا بنیادی فکری لازمہ ہیں۔انسانی تہذیب نے ترقی تو کی ہے مگر اس ترقی کے ساتھ اسے بہت سے مصائب کا سامنا بھی ہے۔جدید تہذیب جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے کیونکہ اس نے انسان کو لاحاصل خواہشات کی طرف دھکیل دیا ہے۔جدید تہذیب کا پروردہ انسان تنہائی کے کرب اور اذیت میں مبتلا ہے۔اسے گھٹن محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ آزاد ہونے کے باوجود آزاد نہیں ہے۔تہذیبی ترقی سے انسان اپنے آپ کی تلاش میں محو ہے مگر بے سود۔بقول آفتاب اقبال شمیم:

گھڑی ہے یہ سوال کی
جنم کی خواب گاہ سے
یہ کس طرف نکل گئی ہے زندگی
یہ رہن سہن کے ہزار ضابطے
تمدنوں کے فیصلے
کی جن میں میری لفظ لفظ سانس ہے گھٹی ہوئی
اس اژدھام بے پناہ کے بنائے قاعدوں میں
جی رہا ہوں
کچھ پتا نہیں کہ ایسی اجنبی جگہ کے
یہ مکین کون ہیں
پتہ نہیں کہ میں ہجوم کی اکائی تو ضرور ہوں
مگر میں کون ہوں![18]

آفتاب اقبال شمیم کی نظم "زمانہ بازار بن گیا ہے" میں نئی ثقافت کو مختلف حوالوں سے بیان کرتے ہیں۔ نئی ثقافت نے انسان کو اس کی حقیقت سے آگاہی دینے کے بجائے اس کی ذات میں ایک ایسے خلا کو جنم دیا ہے کہ انسان کا سکون کھو گیا ہے۔ انسان نئی ثقافت کی چکا چوند روشنیوں میں تو گم ہے مگر اپنے من کی دنیا میں نہیں جھانکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کو اپنی حقیقت کا ادراک اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے من کی دنیا میں جھانکتا ہے۔ جدید متمدن زندگی نے انسانوں کے درمیان زبردست خلیج پیدا کر دی ہے۔ نئی ثقافت نے تنہائی، اجنبیت اور کرب کا احساس بڑھا دیا ہے۔ انسان، انسان سے لاتعلق دکھائی دتا ہے۔ ایک دوسرے کی خوشی میں شریک ہونا اور دکھ درد بانٹنا بے معنی ہو گیا ہے۔ انسان نے اس قدر اپنے آپ کو اپنی ذات میں قید کر لیا ہے کہ اسے باہر کی دنیا کی کوئی خبر نہیں۔ نظم سے حوالہ:

سر جھکا کر میں سوچتا ہوں
مزاح و سنجیدگی کا یہ کاک ٹیل پی کر
امیر تہذیب کی رعایا سرور میں ہے
حواس کو بے حواس رکھنا
نئی ثقافت کا جیسے معیار بن گیا ہے
زمانہ بازار بن گیا ہے [۱۹]

نظم "سٹیٹس کو" میں آفتاب اقبال شمیم نے پاکستان میں سیاسی منظر نامے کو پیش کیا ہے۔ 'سٹیٹس کو' سے مراد ایسی کیفیت ہے جو مدت سے تبدیل نہ ہوئی ہو۔ اس اصطلاح کے منفی معانی غالب ہیں' مراد وہ سماجی قوتیں ہیں جو تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں۔ سیاسی عمل بھی جب جامد ہو جائے اور تبدیلی کا عمل رک جائے تو اسے بھی سٹیٹس کو سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بعض اہلِ سیاست دعویٰ کرتے ہیں کہ سٹیٹس کو کا خاتمہ ان کی منزل ہے۔ عوام کا ایک طبقہ بھی یہ خیال کر تا ہے کہ وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں اور یوں ان کے ساتھ ہم قدم ہو جا تا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ سیاسی عمل سماجی حقائق کے تابع ہو تا ہے۔ جب تک سماجی سطح پر سٹیٹس کو موجود ہے، سیاسی عمل سے اس کا خاتمہ ممکن نہیں ہو گا۔

پاکستان کا سیاسی نظام یکسانیت کا شکار ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہر دفعہ انتخابات کے بعد سیاسی منظر نامے پر صرف سیاسی کردار بدلتے ہیں صورت حال تبدیل نہیں ہوتی۔ عصر حاضر کی عوام تبدیلی کے شوق میں تالیاں بجاتی ہے جشن مناتی ہے اور پھر سیاست دان اپنی سیاست کی دنیا میں گم ہو جاتے ہیں۔ پوری دنیا کا یہ حال ہے کہ سیاست

میں اتار چڑھاؤ سے سیاسی نظام مستحکم نہیں ہوتا۔ حکومت ایسے سیاست دانوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے جن کو نہ تو عوام سے کوئی ہمدردی ہوتی ہے اور نہ ہی قومی سالمیت ان کے لیے اہم ہوتی ہے۔ سیاست دان صرف اپنے مفادات کی جنگ لڑتے ہیں۔ بقول آفتاب اقبال شمیم:

سیاست ایک بازیچہ ہے
جس میں دل کے نابالغ
زمانہ سازیوں کے پختہ ناپختہ کھلاڑی
کھیلتے ہیں
آپ ہی مد مخالف، خود ہی امپائر
ہمیں کیا
ہم تماشائی، جو اصل واقعہ میں
اس تماشے کا تماشا بھی ہیں اپنے تلخ کو شیریں بنا کر
تالیوں پر تالیوں پیٹے چلے جاتے ہیں
ہم بے اختیاری کے مصنف کے لکھے
ناول کے وہ کردار ہیں
جو زور آور کے بنائے ضابطے کی
دہشتوں کے دبدے میں
فالتو رہنے کی حالت پر
قناعت کر چکے ہیں[۲۰]

نظم "میں پورا فرد ہوں" میں آفتاب اقبال شمیم جدید انسان کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ پاکستان کا شمار ان پسماندہ ممالک میں ہوتا ہے۔ سیاست دانوں کی بے لگام لوٹ مار کی وجہ سے ایک بڑی آبادی دو وقت کی روٹی کی محتاج ہے۔ لاکھوں بچے تعلیم سے محروم ہیں، ہزاروں گھرانے بھوک افلاس کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مہنگائی، بے روزگاری نے ان کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ یہاں افراد طبقات میں تقسیم ہیں۔ اس تقسیم کی بنیاد مال و دولت ہے۔ حق بات یہ ہے کہ انسانیت کی تقسیم تو بذات خود انسانیت کی توہین ہے۔ اگر تقسیم کی بنیاد تقویٰ، تعلیم

، ہنر ، محنت یا خلوص ہوتا تو پھر بھی قابل قبول ہوتا لیکن انسانیت کی ایسی بے جوڑ اور بے بنیاد تقسیم باعث شرم ہے ۔ افسوس کی بات ہے کہ آج ہم انسانیت کے کس مقام پہ کھڑے ہیں۔المیہ ہے کہ طبقاتی تقسیم صرف انسانوں کو ہی نہیں تقسیم کرتی بلکہ ان سے جڑی ہر بات کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے ، ان کے مسائل ، ضروریات ، خواہشات ، خوشیاں، نفع و نقصان اور مصروفیات سب کچھ ہی تقسیم ہو جاتا ہے۔

اس طبقاتی تقسیم نے انسان کو داخلی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔اس تقسیم سے وہ اپنے وجود کو ادھورا محسوس کرتا ہے۔وہ اپنی ذات کی تکمیل چاہتا ہے۔انسان اس طبقاتی تقسیم کے خلاف مزاحمت کرتا ہے کہ اسے مکمل فرد کی شناخت دی جائے تاکہ وہ بھی ایک بھرپور زندگی گزار سکے۔طبقاتی تقسیم کا پروردہ یہ آدھا انسان اپنی زندگی کو بے معنی محسوس کرتا ہے اور اپنے وجود کی معنویت کی تلاش میں رہتا ہے۔طبقاتی تقسیم نے بحیثیت فرد اس کی آزادی چھین لی ہے۔آفتاب اقبال شمیم اس طبقاتی تقسیم کے بارے میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

اور میں بھی تم بھی واقف ہیں
کہ میرا جینا لازم ہے، یعنی مجھ پہ لازم ہے
وگرنہ میرے ہونے کے کوئی معنی نہیں بنتے
وجود، ایسا نہیں
بے معنویت کی، کوئی گٹھڑی ہو
جس کو وقت کا بوڑھا مسافر اپنے کندھے پر
اٹھائے چل رہا ہو
تم مجھے تقسیم کرنے کا ہنر رکھتے ہو
سادہ ساز میں زادہ ہوں، میں
تقسیم ہو جاتا ہوں لیکن
اپنے جوہر میں
میں پورا فرد ہوں، وہ مرد ہوں
جس مرد کی پہلی محبت اور منگیتر ہے آزادی [۱۲]

آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم " جینا اتنا آسان نہیں " میں عصر حاضر کے انسان کے مصائب بیان کرتے ہیں ۔جدید انسان کے لیے زندگی مشکل سے مشکل ہوتی جارہی ہے۔انسانی سماج کی ترقی میں مشین نے بنیادی کردار ادا کیا۔انسانی ذہن اور انسانی سماج کا ارتقا دراصل مشین ہی کی ترقی کا دوسرا نام ہے۔انسان کو حیوانات سے ممتاز اور مہمیز کرنے میں مشین ہی بنیاد ہے۔یعنی انسان اور جانور میں فرق یہ ہے کہ انسان نے نہ صرف اپنے ہاتھوں اور جسم سے آزاد مشین بنائی بلکہ اس میں ہر لحظہ تبدیلی کے لیے بھی کوشاں رہا۔انسان نے ترقی کی منازل طے کیں وہاں مایوسی، تنہائی، داخلی کرب اور اضطراب نے اسے ہمیشہ ڈپریشن میں رکھا۔وہ مستقبل سے اپنے مسائل کے حل کے لیے امید باندھتا ہے مگر اس کے اندر کی مایوسی اور بے یقینی اس کی ذات کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔وہ زندگی کے مصائب سے نبرد آزما ہونے کی کوشش تو کر رہا ہے مگر اس کی بے بسی قدم قدم پر اسے مایوس کرتی ہے۔بقول آفتاب اقبال شمیم:

کیا سوچوں میں
اپنی اس سوچ کے بارے میں
یہ زور آور، جو میری ذات کے اندر بھی ہے
باہر بھی۔۔مامور میری نگرانی پر
یہ لفظ مجاور طے کردہ آداب کی
قبلہ گاہوں کے میں اس سے جب انکار کروں

کیا عرض کروں
یہ لاچاری
ہر گام پہ ہے در پیش مجھے
جینا اتنا آسان نہیں
یہ زہر پیالہ جینے کا پینا اتنا آسان نہیں [۲۲]

"مات کی ایک واردات" میں آفتاب اقبال شمیم دہشت گردی سے پیدا ہونے والے خوف سے خوف زدہ عصر حاضر کے انسان کی کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔منظم منصوبے کے تحت مقاصد کے حصول کے لیے پر تشدد کارروائی دہشت گردی ہے۔دہشت گردی بھی ایک ایسا قابل نفرت اور برا عمل ہے جو بہت

تیزی سے اس دنیا میں پھیل رہی ہے اور اس کو جتنا زیادہ روکنے کی کوشش کی جا رہی وہ اتنا ہی تیزی سے پوری دنیا میں پھیل رہی ہے۔اس کا کوئی علاقہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی مذہب۔اس کی جڑیں ہر رنگ نسل اور ہر علاقہ، مذہب، قوم اور ملک میں موجود ہیں۔

پاکستان گزشتہ کئی برسوں سے دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔اس میں ہمارا بڑا جانی اور مالی نقصان ہوا ہے۔ دہشت گردوں کے حملوں میں معصوم شہریوں کے ساتھ ساتھ پاکستان فوج کے بہت سے جوان شہید ہو چکے ہیں۔یہ ا فسوس ناک صورت حال ہے کہ ان دہشت گردی کے خود کش حملہ کرنے والوں میں مسلمان شامل ہیں۔خوش کش حملہ کرنے والا بھی مسلمان اور اس حملے میں شہید ہونے والے بھی مسلمان۔اس نظم کو پڑھ کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ آفتاب اقبال شمیم نے خود کش حملے کے مناظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔دہشت گردی میں شہید ہونے والے لوگوں کی لاشیں چیتھڑوں میں ملتی ہیں ۔جب انسان اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو وہ خوف سے لرز اٹھتا ہے۔ نظم میں کیسی وحشت ناک تصویر کشی کرتے ہیں:

ابن حمزہ نے بارود بکتر، قبا کے تلے
باندھ رکھا تھا
اس وقت فٹ پاتھ پر میں کھڑا تھا
دھماکے میں اڑتا ہوا پارچہ اس کے تن کا
کسی راہ چلتے ہوئے آدمی کے بدن کا
مری آستیں پر گرا تھا
تو میں ایک وحشت کے لرزے میں اچھلا تھا [۲۳]

حوالہ جات

۱۔ آل احمد سرور،نظر اور نظریے،(دلی: کوہ نور پرنٹنگ پریس،۱۹۷۳ء)،ص۱۷۹۔

۲۔ لطف الرحمن،جدیدیت کا آغاز مشمولہ اردو کا افسانوی ادب،مرتب نامعلوم،(پٹنہ: بہار اردو اکیڈمی،۱۹۸۷ء)،ص۱۳۹۔

۳۔ https://www.rekhta.org/articles/ahd-e-jadeed-aur-insani-ehsaas-ki-soorat-gari-mubeen-mirza-articles?lang=ur

۴۔ آفتاب اقبال شمیم۔نادر یافتہ : کلیات ،سعید احمد (مرتب)، ص ۲۹۔

۵۔ ایضاً،ص۳۲۔

۶۔ ایضاً،ص۳۷۔

۷۔ ایضاً،۱۳۹۔

۸۔ ایضاً،۱۵۰۔

۹۔ ایضاً،ص۱۹۱۔

۱۰۔ ایضاً،ص۲۳۹۔

۱۱۔ ایضاً،ص۳۴۸۔

۱۲۔ ایضاً،ص۳۵۲۔

۱۳۔ ایضاً،ص۳۸۲۔

۱۴۔ ایضاً،ص۴۰۶۔

۱۵۔ ایضاً،ص۴۱۱۔

۱۶۔ ایضاً،ص۴۸۱۔

۱۷۔ ایضاً،ص۵۳۳۔

۱۸۔ ایضاً،ص،۵۷۰۔

۱۹۔ ایضاً،ص۵۸۱۔

۲۰۔ ایضاً،ص۷۰۶۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۷۹۴۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۸۳۳۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۸۶۸۔

باب چہارم:

آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کے اسلوب میں عصری حسیت

باب چہارم:

آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کے اسلوب میں عصری حسیت

اسلوب افکار و خیالات کے اظہار و ابلاغ کا ایسا پیرایہ ہے جو دل نشیں بھی ہو اور منفرد بھی ہو۔اسی کو انگریزی میں style کہتے ہیں۔اردو میں اس کے لیے" طرز" یا "اُسلوب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔عربی اور جدید فارسی میں اسی کو "سبک" کہتے ہیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب زبان کا استعمال ادبی مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے تو اس کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے، کیوں کہ یہ عام بول چال کی زبان سے حددرجہ مختلف ہو جاتی ہے۔عام بول چال کی زبان سیدھی سادی، سپاٹ اور ترسیلی ہوتی ہے۔اس کا بنیادی مقصد ترسیلِ معنی یا ادائے مطلب ہوتا ہے۔یہ مروجہ لسانی قاعدوں، ظابطوں اور اصولوں کی پابند نہیں ہوتی ہے۔اس کے بر عکس ادبی زبان علامتی ہوتی ہے۔اس میں لفظی و معنوی صنعتوں اور بدیع و بیان (تشبیہ ، استعارہ، علامت، پیکرتراشی وغیرہ) سے کام لیا جاتا ہے۔نیز اشاروں اور کنایوں میں بات کی جاتی ہے اور اکثر الفاظ کے لغوی معنی مراد نہیں لیے جاتے۔اس میں اظہار بھی براہِ راست (Direct)نہیں ہوتا، بلکہ بالواسطہ ہوتا ہے۔یہ زبان الفاظ و تراکیب سے بھی بوجھل ہوتی ہے۔

اسلوب کی بے شمار تعریفیں بیان کی گئی ہیں۔مختلف عہد کے ادیبوں، نقادوں، عالموں اور دانشوروں نے اپنے اپنے طور پر اسلوب کی تعریف بیان کی ہے مثلاً ایک فرانسیسی عالم بفون (Buffon)نے اسلوب کو شخصیت کا نام دیا ہے۔اس کا قول ہے کہ اسلوب بہ ذاتِ خود انسان ہے (Style is the man himself)اس قول سے اس کی مراد یہ ہے کہ انسان کے کام کرنے کے انداز میں اس کی شخصیت کی جھلکی دیکھی جا سکتی ہے ، یعنی انسان کے ہر کام میں اس کی شخصیت کی چھاپ موجود ہوتی ے۔دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب انسان کوئی کام سر انجام دیتا ہے تو اس پر اپنی شخصیت کی چھاپ چھوڑ دیتا ہے جس سے ہم اس انسان کو پہچان لیتے ہیں، گویا اسلوب کسی انسان کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔اسلوب کی یہ تعریف انسان کی شخصیت کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔فرہنگ ادبیات میں اسلوب کے یہ معنی درج ہیں:

"اسلوب(Style)طرز اظہار، طرز بیان، طرز سخن۔ زبان کا ہر استعمال اپنا ایک مخصوص طرز رکھتا ہے، یہی اسلوب یا سبک ہے۔ اسلوب فرد بہ فرد جداگانہ نوعیت کا حامل بھی ہوتا ہے اس لیے جتنے افراد اتنے طرز (جتنے منہ اتنی باتیں)۔ ہر اسلوب متکلم کے اپنی زبان کے ذاتی تصرف سے پیدا ہوتا ہے جسے شخصی زبان یا نجی بولی کہتے ہیں۔ شخصی زبان معیاری زبان کی ایک خاص شکل ہے یعنی اسلوب سے متکلم کی شخصیت کا عکس جھلکتا ہے، اسی لیے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہر شاعر و ادیب یا ہر شخص کا اپنا ایک لہجہ ہوتا ہے۔[1]

یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اسلوبیات میں ادب یا ادبی تخلیق کے حوالے سے ہی اسلوب کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور کسی شاعر یا ادیب کے اسلوب سے ہی بحث کی جاتی ہے۔ یہ بات بھی نشانِ خاطر رہنی چاہیے کہ ادب میں زبان کے استعمال سے ہی اسلوب معرض وجود میں آتا ہے۔ زبان چوں کہ ادب کا ذریعہ اظہار ہے ، اس لیے زبان کے استعمال کے بغیر کوئی ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا لہذا زبان جیسے ہی ادبی سانچے میں ڈھلتی ہے ، اس میں اسلوب کی کارفرمائی نمایاں ہونے لگتی ہے ۔ادبی زبان اور اسلوب کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ اسی لیے ادبی زبان کے مطالعے کو مطالعہ اسلوب کا نام دیا گیا ہے۔ طارق سعید اسلوب کے حوالے سے کہتے ہیں:

اسلوب میں ہم کسی شاعر کے انداز بیان اور اس کی زبان و بیان کی بنیادی خصوصیات سے بحث کرتے ہیں یا ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مختلف شاعروں کے ہاں زبان و بیان کو کس طرح استعمال کیا گیا ہے یا مختلف ادوار میں کس قسم کی زبان اور لہجہ مروج رہا ہے یا مختلف اصناف اور ہیئتوں میں کس طرح کا اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔[2]

اسلوب کی ماہیت کو سمجھنے کیلئے مصنف کی شخصیت کے علاوہ اسلوب اور خیال کے باہمی تعلق کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اسلوب احساسات اور اظہار خیالات کا بنیادی وسیلہ ہے۔ اگر مصنف اپنے خیالات و احساسات قاری تک پہنچانے میں ناکام رہا ہے تو یہ اس کے اسلوب کا نقص سمجھا جائے گا۔ اسلوب خیالات کا عکس ہوتا ہے۔ اگر خیالات میں الجھن ہو تو اسلوب میں خود بہ خود الجھاؤ پیدا ہو جائے گا۔ مصنف کے ذہن کا یہ الجھاؤ کبھی مشکل اور نا مانوس الفاظ کا سہارا لیتا ہے تو کبھی دور از کار تشبیہات اور استعارات کی راہیں تلاش کرتا ہے۔

اسلوب کی دو اقسام ہیں:

ا۔نثری اسلوب:

نثری اسلوب نثر سے ظاہر ہوتا ہے اور اس میں خیالات کے اظہار پر زور دیا جاتا ہے۔ادا ئے خیال سے مراد یہ ہے کہ مصنف کے ذہنی تجربات بلا کم و کاست راست طور پر قاری کے ذہن تک منتقل ہوجائیں۔اور ترسیل کا عمل بغیر کسی رکاوٹ کے مکمل ہوجائے۔اس کو ابلاغ خیال بھی کہتے ہیں اس کے لحاظ سے ادیب کو وہی اسلوب اختیار کرنا پڑتا ہے جو واضح اور قطعی ہو۔اس میں کسی قسم کی شعریت ، جذباتیت اور مبالغہ آرائی یا استعاروں اور اشاروں کا استعمال نہ ہو۔نثر کی مختلف اصناف نثری اسلوب کی مثالیں ہیں۔نظم کے مقابلے میں نثر میں اپنے اسلوب کی شناخت بنانا ذرا مشکل کام ہے

۲۔شعری اسلوب :

شعری اسلوب شاعری میں اظہار جذبات کے ساتھ مخصوص ہے۔اس میں بلیغ ابہام ہوتا ہے۔لطیف نغمگی ہوتی ہے۔اور ایک ایسی ماورائی کیفیت ہوتی ہے جو قاری کیلئے وجدان کا تاثر پیدا کرتی ہے۔اگر شاعری میں لطیف اورمترنم اسلوب اختیار نہ کیا گیا تو شاعرکو کامیابی حاصل ہونے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔

کسی مصنف کے اسلوب کی تشکیل میں اُس کی شخصیت کی خارجیت اور داخلیت کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔بعض ناقدین نے اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا مظہر کہا ہے۔شخصیت کے ہمیشہ دو پہلو ہوتے ہیں۔ایک خارجی دوسرا داخلی۔خارجی پہلو میں خدوخال ، رنگ و روپ، وضع قطع، چال ڈھال وغیرہ ہوتے ہیں۔جبکہ داخلی پہلو میں اس کے احساسات ، خیالات، نظریات، مشاہدات پر رد عمل وغیرہ ہوتے ہیں۔خارجی پہلو بہ ظاہر آسانی سے نظر آجاتا ہے۔جبکہ داخلی پہلو جاننے کیلئے مصنف سے تبادلہ خیال کرنا اور اس کی تحریروں کا مطالعہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ہر شخص کے سوچنے اور محسوس کرنے کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔اور وہ اپنی تعلیم و تربیت کی بنا اپنے خیالات کو منفرد انداز میں اظہار کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔

مرزا خلیل احمد بیگ اسلوب کے حوالے سے اپنی زبان اسلوب اور اسلوبیات میں لکھتے ہیں کہ مصنف کی امتیازی خصوصیات یاانفرادیت کے نقطہ نظر سے اسلوب کی جو تعریف کی گئی ہے وہ اس نظریے پر مبنی ہے کہ ہر مصنف کا زبان کے استعمال کے سلسلے میں اپنا ایک الگ مخصوص رویہ اور منفرد انداز ہوتا ہے ب جو اسے دوسرے مصنف سے

ممیز کرتا ہے جس طرح ایک زبان کے محاورے کو دوسری زبان کے محاورے میں ترجمہ نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح کسی مصنف کے اسلوب کو جو اس کی ذاتی ملکیت ہوتا ہے نہ کوئی مصنف اسے اپنا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی تقلید کر سکتا ہے۔[۳]

اسلوب کے تشکیلی عناصر میں خیال اور زبان کی خصوصیات شامل ہوتی ہیں۔ کوئی مصنف یا شاعر زبان و بیان کے مخصوص الفاظ' تشبیہات' استعارے اور تراکیب کو مخصوص انداز میں یا اکثر استعمال کرتے ہوئے اپنے منفرد اسلوب کی صورت گری کرتا ہے۔ شاعری کی دنیا میں لفظ اور معنی کے درمیان ایک مخصوص رشتہ پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ رشتہ کچھ پیچیدہ نوعیت کا ہوتا ہے۔ لفظ اور معنی کے رشتے میں بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن میں وقت، سماج، تہذیب و ثقافت وغیرہ اپنا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے الفاظ کے معنی میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ تبدیلی کا یہ عمل اس وجہ سے بھی فائدہ مند ہوتا ہے کیونکہ معنی کی تبدیلی اور ارتقا کی بدولت زبان میں تازگی کا احساس باقی رہتا ہے۔ شاعر موقع محل کی مناسبت سے ان الفاظ کا استعمال کر کے شاعری کو حسن و جمال بخشتے ہیں۔ شعر و ادب میں صنائع کا استعمال لفظ اور معنی کے تعلق سے متعلق ہے۔ اس وجہ سے ان کو صنائع معنی کہا جاتا ہے۔ جن میں تشبیہ، استعارہ، تلمیح، علامت اور تمثیل وغیرہ شامل ہیں۔ انہی معنوی صنائع کو آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں عصری حسیت کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

تشبیہ:

علم بیان کی رو سے جب کسی ایک چیز کو مشترکہ خصوصیات کی بنا پر کسی دوسری چیز کی مانند قرار دیا جاتا ہے تو اسے تشبیہ کہتے ہیں۔ تشبیہ کا مقصد اس پہلی چیز کو کسی صفت، حالت یا کیفیت کو واضح اور موثر بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے اس سے کلام میں فصاحت و بلاغت پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً رخسار پھول کی مانند ہے میں رخسار کو پھول سے تشبیہ دی گئی ہے جبکہ رخسار اور پھول دو مختلف چیزیں ہیں لیکن رنگت اور ملائمت کی صفت دونوں میں موجود ہے۔

استعارہ:

استعارہ کے لغوی معنی ادھار لینا ہیں۔ اصطلاح میں استعارہ سے مراد یہ ہے کہ کسی شے کے لوازمات کو کسی اور شے سے منسوب کر دیں۔ مثلاً بہادر شخص کو شیر کہہ دیں۔ دلیری اور شجاعت شیر کا خاصہ ہے۔ اس کے لوازمات انسان سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔ استعارہ میں لفظ مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہوتا ہے۔ تشبیہ میں حرف تشبیہ موجود ہوتا ہے جبکہ استعارہ میں حرف تشبیہ موجود نہیں ہوتا۔

تلمیح:

کلام میں مشہور واقعہ، قصہ، کہانی، آیت قرآن یا کسی فن کی اصطلاح کی طرف اشارہ کرنا تلمیح کہلاتا ہے۔ مثلاً آتش نمرود سے وہ واقعہ مراد ہے جب حضرت ابراہیمؑ کو نمرود نے آگ میں پھینکا تھا اور آگ گلزار بن گئی۔

علامت:

علامت میں کوئی لفظ لغوی معنوں کی بجائے کسی اور معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لغات میں ہر لفظ کے ایک مخصوص معانی ہوتے ہیں یعنی ہر لفظ کسی خاص معنی کے لیے وضع ہوا ہے۔ اگر ہم لفظ کو اس کے مخصوص معنی کے بجائے اس سے کوئی دوسرے معنی مراد لیں تو یہ علامت ہو جائے گی۔ جیسے کلاسیکی شاعری میں گل و بلبل، شمع و پر وانہ، بادہ، جام اور آشیاں وغیرہ علامتوں کی مثالیں ہیں۔

ترکیب:

ترکیب (Composition) دو یا اس سے زائد الفاظ کا وہ آمیختہ (Blend) ہے جو نئی معنوی تشکیل کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اصطلاح میں ترکیب سے مراد دو یا زائد الفاظ کا وہ جوڑا جو کسی اصول کے تحت اس طرح یکجا کر دیا جائے کہ ایک معنوی اکائی کی تشکیل ہو۔ مثلاً لفظِ ''خلش'' اکیلا لفظ ہے۔ اور عمومی معنٰی رکھتا ہے لیکن جب اس کے ساتھ اصولِ اضافت کے تحت دوسرا لفظ ''آزار'' جوڑا تو یہ ترکیب «خلشِ آزار» بنی جو معنوی طور پر محدود ہو کر مخصوص معنوی اکائی بن گئی ہے۔

کسی بھی زبان کے شعر و ادب میں تشبیہات اور استعارات کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ تشبیہات و استعارات کے ذریعے لفظوں کی دنیا نت نئے معنی تخلیق ہوتے رہتے ہیں جو فکر و احساس کو تازگی بخشتے ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی بھی ادب کے شعری اور نثری سرمایے میں تشبیہات و استعارت کے استعمال کی کمی ہو جائے تو ادب میں زبان کی خوبصورتی ماند پڑنے لگتی ہے۔ اسی لیے ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ تشبیہات اور استعارات ادب کی روح ہیں۔ تشبیہات و استعارات شعر کو معنوی تہ داری کا حسن عطا کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات کے استعمال سے کلام مختصر ہو جاتا ہے اور کلام کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ آفتاب اقبال شمیم کی نظمیں تشبیہات و استعارات سے مزین ہیں۔ احتشام علی کی کتاب جدید اردو نظم میں عصری حسیت کے تناظر میں باب اول میں جو نظری خاکہ دیا گیا ہے اس کے مطابق اسلوب سے مراد طرز بیان، طرز سخن اور طرز اظہار لیا جاتا ہے۔ ہر شاعر اور ادیب کا اپنا مخصوص اور

منفرد انداز تحریر ہوتا ہے۔اسلوب مختلف ہونے کی وجہ سے ہر ادیب اور شاعر کا اپنا ایک خاص لہجہ ہوتا ہے۔نئے شاعروں نے گنے چنے مضامین کا انتخاب چھوڑ کر نئے امیجز ،تشبیہات ،استعاروں ،تراکیب ،علامتوں ،مکالماتی انداز ،ڈرامائی انداز اور انگریزی الفاظ کی معنویت اپنی نظموں کی ساخت میں منقلب کیا۔اس نظری خاکے کی روشنی میں آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کے اسلوب میں عصری حسیت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم "نیا عہد نامہ" میں تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں۔اس نظم کے کچھ ٹکڑے ملاحظہ ہوں جن میں انھوں نے استعارے کا استعمال کیا ہے:

دمہ زدہ موٹروں میں ہم رینگتے رہیں گے [۴]

اس سطر میں استعارے کا استعمال کیا گیا ہے۔دمہ زدہ موٹروں کے استعارے کا مطلب ہے کہ انسان جدید تہذیب میں دمہ زدہ بیمار موٹریں بن گئی ہیں جو گھٹ گھٹ کر سانس لیتی ہیں اور زمین پر اس کی زندگی محال ہو گئی ہے۔ جدید تہذیب کی صنعتی ترقی نے انسان کو طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا کر دیا ہے ۔اس طرح آفتاب اقبال شمیم استعارے کے استعمال سے نظم میں معنویت اور وسعت پیدا کرتے ہیں کیونکہ استعارے میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ شاعر کے شدید جذبات اور احساسات کا مکمل اظہار کر سکے۔

" نظم سنگ بے حیا" میں آفتاب اقبال شمیم نے عصر حاضر کے انسان کی داخلی کشمکش ،اضطراب ،لاحاصلی اور بے بسی کی کیفیات کو بیان کیا ہے۔بقول آفتاب اقبال شمیم:

تیس برسوں سے روکی ہوئی سانس
سینے میں سولی کی مانند لٹکی ہوئی [۵]

سانس کی ڈوری کا چلنا انسانی زندگی کی علامت ہے جسے نے آج کے انسان کو کرب اور اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔سینے میں روکی ہوئی سانس کو سولی کی طرح لٹکنے سے تشبیہ دی ہے۔ان نظم میں شاعر نے قیدیوں کی بے بسی کا منظر پیش کیا ہے جو ہر روز قید خانوں کی دیواروں سے اپنے سر پٹکتے ہیں اور اپنی سانسوں کو گن گن کر گزار رہے ہوتے ہیں۔اس طرح آفتاب اقبال شمیم تشبیہ کے استعمال سے معنی آفرینی اور اختصار و جامعیت پیدا کرتے ہیں۔

نظم "اے وطن" سے استعارے کی مثال ملاحظہ ہو:

گنج بخشش پہ بیٹھے ہوئے اژدھوں کی شرر بار پھنکار سے
تیرے فرزند جلسے ہوئے [۶]

اس نظم میں آفتاب اقبال شمیم نے وطن سے لازوال محبت، پاکستان کے سیاسی اور سماجی حالات اور جبریت کے نظام کے خلاف مزاحمتی لہجہ اختیار کیا ہے۔ان سطور میں انھوں نے اژدھوں کا لفظ بطور استعارہ استعمال کیا ہے جس سے طاقت ور اور مقتدر طبقہ مراد لیا گیا ہے جو ملکی سیاست اور وسائل پر قابض ہے۔ان کے جابرانہ اور آمرانہ رویوں نے عام شہری کو اذیت اور پریشانیوں میں مبتلا کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں۔ مجبوری اور مقہوری کے عالم میں زندگی کی سانسیں گن رہے ہیں۔آفتاب اقبال کی شاعری میں استعاروں کا استعمال ان کے اعلیٰ تخیل کا ثبوت ہیں۔

نظم "افریقہ۔۔۔۔۔۔۔اگلے محاذ پر" سے استعارے کی مثال:

عنتر نے دھاوا بولا ہے
دیکھ! سفید انسانیت کے خیموں پر
کل آزادی کی ہریلی پھوٹے گی۔۔۔۔۔۔۔۔اور یہ بیلیں
پیڑوں کا رس پینے والی نیلی بیلیں
جڑ سے کاٹی جائیں گی[۷]

اس نظم میں افریقہ میں جنگ آزادی کی منظر کشی کی گئی ہے۔یہ نظم شاعر کی عالمی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔اس نظم میں استعمال ہونے والے استعارے شاعر کے منفرد اسلوب اور نئے طرز اظہار کا ثبوت ہیں۔جیسے عنتر نے دھاوا بولا ہے، سفید انسانیت کے خیموں پر، پیڑوں کا رس پینے والی نیلی بیلیں جیسے استعارات اور تراکیبیں عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی ایک کوشش ہے۔اقوام عالم تیسری دنیا میں ہونے والے ظلم و جبر پر خاموش تماشائی بنا ہوا ہے۔یہ سامراجی قوتیں ان ممالک کا خون چوس رہی ہیں۔ قتل و غارت گری سے نہتے شہریوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح مار رہی ہیں۔

"رچوئل "آفتاب اقبال شمیم کی علامتی نظم ہے جس میں تاریخ کے دوہرانے کا عمل موسموں کے بدلنے کی صورت میں ظاہر کیا ہے۔انسانی زندگی کی ابتدا سے یہی سلسلہ چلتا آرہا ہے۔ خزاں کے بعد بہار ضرور آتی ہے اور ایک بنجر پن سے تخلیقی عمل ضرور شروع ہوتا ہے۔اس نظم میں زانیہ کو جدید تہذیب و تمدن کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔جدید تہذیب نے انسان کو جنسی ہوس میں مبتلا کر دیا ہے۔یہ تہذیب انسان کو زوال کی طرف لے کر جا رہی ہے۔اس نظم میں اسرار کی ایک فضا موجود ہے۔ایک سطح پر انتہائی شخصی اور ذاتی نظر آتی ہے لیکن دوسری سطح پر علامتی اور کسی وسیع مفہوم کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ نظم سے حوالہ:

زانیہ ہے کھڑی
اس کے گدلے ابلتے ہوئے جسم میں
کتنے برسوں سے غرا رہی ہے ہوس لذت سنگ کی
سوچتی ہے کہ کب فروری ختم ہو
خشک پتے کو
بنجر بگولے کے ہسٹریا سے رہائی سے ملے[8]

نظم "ستمبر کا شہر" میں تمثال کاری، استعارے اور علامتوں کی بلیغ پرتوں کے حوالے شاعر نے منفرد لہجہ اپنایا ہے۔ نظم "ستمبر کا شہر بیانیہ رنگ میں ہے۔ کہیں کہیں مصرعوں کی تکرار سے نظم کو مربوط کیا گیا ہے۔ یہاں پر ان کی تمثالوں پر نگاہ ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے جنہیں شاعر کے مشاہدے سے زیادہ اس کی کی متخیلہ نے تخلیق کیا ہے اور کہیں کہیں تجریدی محسوسات کو زندہ پیکر عطا کیے گئے ہیں۔ نظم سے مثال:

کوئی چھلاوا
بلند چیلوں
سفید، یخ بستہ چوٹیوں پر
کھڑا ہے سرما کی دھوپ کا تاج سر پہ پہنے [9]

نظم "درخت" میں درخت انسان کا استعارہ ہے۔ اس نظم میں جدید انسان کے خدوخال فطرت کے تناظر میں ابھارے ہیں۔ صنعتی انقلاب نے انسان اور فطرت کے مابین رشتے کو ختم کر دیا ہے۔ درخت ایسے انسان کا استعارہ بھی ہے جسے ہم نے مختلف قسم کی زنجیریں پہنا رکھی ہیں جو داخل کی گہرائیوں میں زندگی کا اصل جوہر ہے۔ لیکن کنکریٹ کی عمارتوں اور استحصالی نظاموں کا زندانی ہے۔

درخت ایک ایسے انسان کا استعارہ بھی ہے جو کسی بھی طرح کی مشکل صورت حال کے سامنے استقامت سے ڈٹا رہتا ہے۔ کبھی اس کے بدن کا کوئی حصہ کٹتا ہے تو کبھی کوئی۔ کبھی وہ پھانسیوں اور پھندوں میں جھولتا ہے اور کبھی زندگی کی دکھ جھیلتا ہے۔ وہ زخم سہنے کے باجود نئے عہد نامے رقم کرتا ہے۔ کبھی جھکتا نہیں دوسروں کے سامنے۔ انسان کی اس استقامت کی وجہ سے ہی وہ اپنے جیسے انسانوں کے لیے مشعل راہ بنتا ہے۔ نظم سے حوالہ:

وجود میرا
گیاہ زاروں کے بیچ میں جیسے کوئی سمٹا ہوا ہو صحر

میں اپنی پہچان کا جزیرہ ہوں
جس میں بدمست پیل پیکر سوال
چنگھاڑتے ہیں
بے اطمینانیوں کی بلائیں، اندھی انائیں ہر سو
نہیں، نہیں کی کٹار چیخوں پہ ناچتی ہیں
تجھے وفا کے، عبادتوں کے صلے میں شاید
صدا کا نروان مل گیا [۱۰]

"۱۳ مارچ (حبیب جالب)" میں استعارے کا استعمال ملتا ہے۔ یہ نظم حبیب جالب کی یوم وفات کے حوالے سے تحریر کی گئی ہے۔ اس نظم میں حبیب جالب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے استعارے کا استعمال کیا ہے۔ حبیب جالب ایک انقلابی شاعر تھے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ ایوب خان اور یحیی خان کے دور آمریت میں متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ جالب کو ۱۹۶۰ء میں جیل جانا پڑا اور وہاں انہوں نے کچھ اشعار لکھے "سرِ مقتل" کے عنوان سے جو حکومتِ وقت نے ضبط کر لیے لیکن انہوں نے لکھنا نہیں چھوڑا۔ جالب نے ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء میں بہت خوبصورت شاعری کی جس میں انہوں نے اس وقت کے مارشل لا کے خلاف بھرپور احتجاج کیا۔ آفتاب اقبال شمیم اس عظیم شاعر کی موت کو ایک بڑا سانحہ قرار دیتے ہیں۔ نظم سے حوالہ:

بہت رویا تھا، دھاڑیں مار کر رویا تھا
کل شب آسماں
اور آج بستی کی منڈھیروں پر
صفیں باندھے کھڑی ہے دھوپ، کہتے ہیں
کہ وہ شوریدہ سر
پھولوں کی بکل مار کر گزرے گا اس چپ چاپ سڑکوں سے
وہ ہی جو سونت کر شمشیر آواز برہنہ کی
اندھیرے سے لڑا چالیس برسوں تک [۱۱]

آفتاب اقبال شمیم اس نظم میں استعاروں کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ استعارہ ان کے تخیل میں حقیقت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ یہ مجاز ہوتا ہے مگر جب اسے آفتاب اقبال شمیم استعمال کرتے ہیں تو یہ حقیقت سے زیادہ لطف دیتا ہے۔ حقیقت گویا مبالغے کے پردے میں تخیل کے رنگ و نور سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ حبیب جالب کی موت کا منظر المناک صورت حال کو بیان کرتا ہے۔ آسماں بھی اس عظیم ہستی کے بچھڑنے پر دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہے۔ دھوپ بھی خاموش ہے اور صفیں باندھ کر کھڑی ہے۔ یہ انقلابی اور عظیم شاعر پھولوں کی چادر میں لپٹا خاموشی سے گلیوں میں سے گزرتا ہوا اپنی آخری آرام گاہ میں پہنچ جائے گا۔

آفتاب اقبال شمیم کی نظم "زمین اور میں" ایک استعارے کی بنیاد پر کہی گئی نظم ہے۔ پوری نظم میں اسی ایک استعارے کی مناسبت سے تلازمات موجود ہیں۔ نظم کی ابتدا سے چند سطریں:

پھر مجھے ماں نے
پلو میں باندھی ہوئی وقت کی ریزگاری کے
دو چار سکے تھما کر
عجب پیار سے تھپتھپاتے ہوئے یوں کہا
جاؤ نا! جا کے عمروں کے میلے سے ہو آؤ نا! [۱۲]

نظم کی ان ابتدائی سطروں میں استعارے کا استعمال کیا گیا ہے۔ ماں کا استعارہ جو زمیں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ دوسرا استعارہ دو چار سکے کے الفاظ کی صورت میں ہے۔ یہاں پر الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں قطعی استعمال نہیں ہوئے بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اور ان کے مجازی معنی انسانی زندگی کا مختصر دورانیہ ہے۔ تیسرا استعارہ عمروں کے میلے کے روپ میں آیا ہے۔ عمروں کا میلہ زندگی اور زندگی کی رونقوں کے حوالے سے استعمال ہوا ہے۔

نظم "سٹیٹس کو" میں آفتاب اقبال شمیم نے پاکستان کی سیاسی صورت حال کو استعارے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس میں وہ پاکستان کے سیاسی نظام پر طنز کرتے ہیں کہ سیاست ایک کھیل کا میدان بن چکی ہے جس میں نابالغ ذہن کے کھلاڑی کھیلتے ہیں۔ ان کھلاڑیوں سے مراد ہمارے وہ سیاست دان ہیں جو ابھی فکر و اور نظریات کی دنیا میں ناپختہ ہیں۔ ان کے ان ناپختہ ذہنوں کی وجہ سے ہمارا سیاسی نظام زوال کا شکار ہو گیا ہے۔ اوپر سے ہماری عوام کا یہ حال ہے کہ ہمیشہ ان سیاست دانوں کے ہاتھوں بے وقوف بن جاتے ہیں۔ ہمارے سیاست دان اپنی پر جوش تقاریر میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ عوام سمجھتے ہیں کہ ان کے آنے سے ہماری تقدیر بدل جائے گی۔

سیاست ایک بازیچہ ہے

جس میں دل کے نابالغ
زمانہ سازیوں کے پختہ ناپختہ کھلاڑی
کھیلتے ہیں
شام کے چینل
مطب ہیں جن میں دم پھونکے ہوئے
لفظوں کی پڑیا میں منشی ادویہ
ہر کوچہ و بازار میں تقسیم ہوتی ہیں [13]

ان سطور میں ٹی وی چینلز کو نیم حکیم کا مطب قرار دیا گیا ہے جہاں پہ کیے جانے والے مباحثے انسان کی فکر کو بیدار کرنے کی بجائے منشی ادویہ کا کردار ادا کر رہے ہیں جو انسان کی فکری پستی کی وجہ ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر میڈیا عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرے تو ایمان دار سیاست دان حکومت میں آئیں جس سے لوگوں کے حالات میں تبدیلی آئے۔ آفتاب اقبال شمیم تشبیہات اور استعاروں سے مجاز میں حقیقت کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ شاعری میں تشبیہات اور استعاروں کے حوالے سے اسرار احمد اپنی کتاب غالب کی شاعری میں تشبیہات و استعارات میں لکھتے ہیں:

> تشبیہ و استعارہ اپنا خاص درجہ رکھتے ہیں۔ یہ لفظی صنائع سے زیادہ تاثیرات کے حامل ہیں بلکہ یہ انسانی نفسیات کو فطرت سے قریب تر کر دیتے ہیں۔ شاعر جب کوئی نادر اور اور یجنل استعارہ استعمال کرتا ہے تو اس کا اثر شدید ہوتا ہے۔ جیسے بڑی حقیقت کا اچانک انکشاف ہو گیا ہو۔ استعارے سے حقیقت کا اظہار سیدھا سادہ یا براہ راست نہیں ہوتا بلکہ اس میں پیچیدگی اور تہ داری آجاتی ہے۔ تصویر کشی بھی ہو جاتی ہے۔ اس سے نہ صرف وقت باصرہ لذت یاب ہوتی ہے بلکہ دوسری قوتیں بھی محفوظ ہوتی ہیں۔ [14]

نظم "ہوا کی بیٹی" ایک استعارتی نظم ہے جس میں ہماری تہذیب، سماجی نظام اور رسم و رواج کو معاشرے کے تناظر میں پیش کیا ہے جہاں انسان مجبوری کے عالم میں گزر بسر کرتا ہے۔ نیچے دی گئی سطور میں سایہ کا لفظ رسوم کے استعارے کو طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح گرہن کا لفظ استعارتی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چاند کے تلازمے نے معنوی حسن کے ساتھ ساتھ آسان فہم بھی بنایا ہے۔ گرہن رسم و رواج کے جبر کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس کے زیر اثر ایک عورت کی پہچان اور شناخت ایسے ماند پڑ جاتی ہے کہ جیسے چاند گرہن کا شکار ہو کر وہ اپنی اصل شناخت سے عاری ہو گئی ہو۔ معاشرتی رسم و رواج اور روایات کسی ایک نسل سے متعلق نہیں بلکہ مرحلہ وار نسل در نسل ان کا

سلسلہ جاری ہے۔ جس طرح انسان اور سایے کا اٹوٹ رشتہ ہے ویسے ہی رسوم کا مشرقی معاشرے میں آدمی سے عمر بھر کا رشتہ ہے۔ نظم سے حوالہ:

رسم تو آدمی کا سایہ ہے، عمر بھر
ساتھ چلنے والا
وہ چاند جیسی حسین عورت،
وہ بنت حوا۔۔۔۔۔۔۔ گرہن میں ہے[۱۵]

نظم "شور کے تہوار" میں محبت کے موضوع پر چار مختلف استعارات استعمال کیے گئے ہیں۔ ایک ہی موضوع کے لیے چار استعاروں کے استعمال سے نظم میں شروع سے ہی دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ جیسے کہ نیچے دی گئی سطور میں گلابی انگلیوں کا لمس محبت کے جذبے کی نفاست اور نزاکت کے لیے بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح شفاف آنکھوں کی نمی جذبہ محبت کے سوز اگداز کی آئینہ دار ہے جبکہ پھول کی پہلی چٹک کا قہقہہ محبت کے زیر اثر ایک عاشق کی جذبہ و مستی اور کیف و سرور کی حالت کا عکاس ہے۔ جب محبت کرنے والا شخص اپنی زندگی میں محبت کی خوشبو کو محسوس کرتا ہے تو وہ محبت کے جزیروں میں میں سانس لینے لگتا ہے۔ چوتھی سطر میں محبت کی طاقت ایک ایسی علامت کا روپ اختیار کر لیتی ہے جو ایک معمولی درجے کے انسان کو عظمت کی بلندی تک پہنچا دیتی ہے۔ اس سطر میں بے حوالہ خاک کا استعارہ ہے اس سے مراد ایک عام اور بے مایہ انسان ہے جبکہ افلاک میں عظمت اور سربلندی کے معنی پوشیدہ ہیں۔ نظم سے حوالہ:

محبت تو گلابی انگلیوں کا لمس ہے
شفاف آنکھوں کی نمی ہے
پھول کی پہلی چٹک کا قہقہہ ہے
بے حوالہ خاک میں افلاک کا منظر دکھاتی ہے[۱۶]

تشبیہ اور استعارہ آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کا لازمی جز معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے ان کے کلام میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ خیالات و فکر کی وضاحت ہوتی ہے۔ قاری کے سامنے رنگین اور خوبصورت استعارے حقیقت کی دنیا میں سانس لینے لگتے ہیں۔ اپنے کلام میں آفتاب اقبال شمیم تشبیہات استعارات کے ذریعے اپنی فکری بصیرت کو ایک وسیع کینوس پر پیش کرتے ہیں جس سے ان کے خیالات وافکار میں تہ داری پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا تشبیہ و استعارے کا استعمال ان کے تجربات کی عکاسی کرتا ہے۔

آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں بہت سی جگہوں پر علامت نگاری کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی نظموں میں علامتی رنگ غالب ہے۔ بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن کا تانا بانا کسی مخصوص علامت کے گرد بنا گیا ہے۔ ڈاکٹر انیس اشفاق علامت کی تعریف کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ علامت سے مراد ایک ایسا بیان ہے جس سے کچھ الگ معنی مراد لیے جائیں۔ علامت ہمارے ذہن کو معنی کی کئی جہتوں کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ ہر جہت کے لیے موزوں قرار پائے۔ علامتی اظہار خود بیان واقع ہوتا، لیکن اس بیان واقع کے ظاہری مفہوم سے ذہن اس مفہوم کے مماثل کسی اور مفہوم کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے۔[۱۷]

آفتاب اقبال شمیم کی نظم "آدم زاد" کی نیچے دی گئے مختلف سطروں میں علامتوں کے ذریعے نظم کا سارا مضمون پیش کیا ہے جس سے لفظوں کی معنویت باآسانی سمجھی جاسکتی ہے۔ نظم میں زمیں کی تنگیاں عہد حاضر کی انسانی نفسیات کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ انسان کی تنگ دلی کی علامت بھی ہیں۔ دیواریں انسانوں کے باہمی تعلقات میں پیش آنے والی رکاوٹیں ہیں جو فاصلوں اور دوریوں کو جنم دیتی ہیں۔ یہ دیوراییں علاقائی، لسانی، مذہبی، نسلی، رنگ و فرقے اور عقائد و نظریات کی دیواریں ہیں جنھوں نے انسان کو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہی تقسیم انسانیت کی قاتل اور زوال کا سبب بنتی ہے جس نے خون ریزی کے کلچر کو جنم دیا ہے اور کرہ ارض کے امن وامان کو تباہ کر دیا ہے۔

انجیر و زیتوں کے گیاہستاں اس امن کی علامت ہیں جسے انسان کی گروہ در گروہ تقسیم کے عمل نے لہولہو کر دیا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادیوں میں گھٹتی ہوئی چاندنی کی وجہ یہی نفرتیں ہیں جن سے انسان دوسروں کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔ اس نظم میں چاندنی انسان کا آپس میں انس و محبت، بھائی چارہ اور خیر کے جذبات کی علامت ہے۔ یہ چاندنی شب تاریک میں بھی انسان کے لیے باعث راحت ہے۔ چاندنی کا فقدان انسان کے باہمی رابطوں میں رکاوٹوں اور نفرتوں کا نتیجہ ہے۔ انسان طائر، شجر یا پربت بن جانے کی التجا کرتا ہے۔ پرندے، پیڑ اور پہاڑ اپنی اپنی نوع میں دوسروں پہ انحصار نہ کرنے کے باعث آزادی اور آزاد خیالی کی علامت ہیں۔ وہ ایک ایسا معاشرہ جنم نہیں دیتے جس میں انسان کی آزادی کسی نظریے یا عقیدے سے مشروط ہو۔ نظم سے حوالہ:

زمیں کی تنگیوں کو اپنی بخشش سے کشادہ کر
کہ سجدہ کر سکوں
کیا یہ دیواریں
سدا اٹھتی رہیں گی میرے سینے پر
بتا یہ رنگتیں، یہ دوریاں پیدا ہوئی ہیں

کس کی دانش سے
بتا میرے لہو لہو میں ڈوبتے جاتے ہیں
انجیر و زیتوں کے گیاہستاں
بڑھتی ہوئی آبادیوں
چاندنی کیوں گھٹ گئی
خداوندا!
مجھے طائر، شجر، پربت بنادے [18]

"پیاسوں کے لیے ایک نظم" میں آفتاب اقبال شمیم کی علامتی نظم ہے جس میں انھوں نے ماضی کے حوالے سے علامتیں استعمال کی ہیں۔ ٹھہرے منظر کی علامت میں منظر وقت، زمانہ، معاشرہ، حالات یا گرد و پیش کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ ٹھہرے منظر کی ترکیب جمود کی علامت ہے۔ اسی طرح سایہ گرفت یا حصار کی علامت ہے جو زمان و مکاں کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔ دکھ کی دیروز سرائے ماضی کی علامت ہے۔ یہ علامتیں ایک ایسا منظر تخلیق کرتی ہیں جس میں عام انسان کی زندگی نامساعد حالات کا شکار ہے۔ جمود کا عفریت انسانی معاشرے کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے چکا ہے جس کی وجہ ماضی پرستی ہے۔ ایسے انسان جن کی آنکھوں میں تبدیلی اور روشن مستقبل کے خواب ہیں انہیں یہ حالت سخت اذیت میں مبتلا کیے رکھتی ہے۔ نظم سے حوالہ:

ہم وارث تخت تمنا کے
ٹھہرے منظر کے سایے سے کب نکلیں گے
دکھ کی دیروز سرائے سے کب نکلیں گے [19]

نظم "زمیں اور میں" آفتاب اقبال شمیم نے موت کی منظر کشی کی ہے۔ شام، نیم پختہ گلی، بے نام کرتی ہوئی لوری اور شب خواب جیسی علامتوں کا استعمال کیا ہے۔ علامتوں کے اس استعمال سے ان کا اسلوب منفرد ہو گیا ہے۔ شام ایک ایسا وقت ہے جب سورج ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور شام کے سایے رات کی تاریکی میں بدل جاتے ہیں۔ شام کے منظر نامے پر زندگی کی رونقیں ماند پڑ جاتی ہیں۔ رات کے پر سکون لمحوں کا آغاز ہو رہا ہوتا ہے۔ اس نظم میں انہیں معنوی مناسبتوں کی بنیاد پہ شام کو انسانی زندگی کے ڈھلتے ہوئے سایے کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ ڈھلتا ہوا سایہ انسان کی موت کے وقت کی پیشگی اطلاع ہے۔ نیم پختہ گلی سے مراد نسانی کی آخری آرام گاہ (قبر) ہے۔ بے نام کرتی ہوئی لوری اور شب خواب کی علامتیں موت کا منظر واضح کر رہی ہیں۔ نظم سے علامتی مثالوں کا حوالہ:

دور پچھم میں جب شام کا جامنی بادلہ لہلانے لگے
اولیں گرم بوسے کی خوشبو سے مہکی ہوئی
نیم پختہ گلی یاد آنے لگے
لوٹ آنا، یہاں جس جگہ
بے پتہ اور بے نام کرتی ہوئی ایک لوری کی لے [20]

نظم "شگفت" ایک علامتی نظم ہے جس میں آفتاب اقبال شمیم نے خواب کی علامت کو تین مختلف موقعوں پر تین مختلف مفاہیم میں پیش کیا ہے۔ یہاں خواب کا پہلا استعمال ایک قوت تحریک کے معنوں میں پیش کیا گیا ہے۔ ایسی تحریک جس نے انسانی کے تنگ و تاریک رستوں کو آسانیوں کی روشنی سے منور کر دیا ہے۔ چپ کی خاک انسان کی تھکن اور بے بسی کی عامت کے طور پر ابھرتی ہے۔ جب کی ہری آوازیں جذبوں کی جوانی کی علامت ہیں۔

خواب نے ایک تحریک کی صورت میں مایوس اور تھکن زدہ معاشرے کو حوصلے اور ہمت کی امید دی ہے۔ انہیں اچھے لمحوں کی تلاش میں مصروف سفر پر آمادہ کیا ہے۔ خواب کی علامت روشن مستقبل کی علامت بن جاتی ہے ۔ایک ایسا روشن مستقبل جو تمام انسانوں کے لیے خوشحالی کی خبر لے کر آتا ہے۔ خواب کے علامتی معنی رجائیت اور امید کے ہیں۔ ایسے عالم میں جب انسان مایوسیوں کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہوتا ہے۔ تیسری بار خواب کا لفظ پہلے دونوں علامتی مفاہیم سے جدا نظر آتا ہے۔ یہاں پہ خواب کی علامت میں تین طرح کے ممکنہ مختلف مفاہیم موجود ہیں۔ رہنمائی ، جستجو اور زندگی کا جواز یا مقصدیت ان تینوں مفاہیم کی معنویت لفظ خواب میں موجود ہے۔ نظم سے حوالہ:

ایک خیالِ خواب افروز کی کرنوں نے
اپنے نور سے درزیں بھر دیں بستی کے دروازوں کی
چپ کی خاک سے تانیں پھوٹیں
ہری ہری آوازوں کی
ایک نگاہِ فرداز ادبلندی سے
کیسی کیسی رمزیں لے کر آئی دامن میں
پھیلی جن سے خوابوں کی خوشحالی آنگن آنگن میں
ایک صدائے دور نما نے اپنے قول کی برکت سے
صدیوں کی نادار زمیں کو تحفہ کیا نایاب دیا

مٹی کو ایک سمت عطا کی، آنکھوں کو ایک خواب دیا [۲۱]

نظم " زمانہ بازار بن گیا ہے " علامتی اسلوب کی نمائندگی کرتی ہے۔ عصر حاضر کے سرمایہ دارانہ نظام کی علامت کے طور پر پلازہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ انسان جذبات واحساسات کے قتل کے باوجود یہ نظام اپنی بلندیوں کی طرف گامزن ہے۔ پلازوں نے باغ کی جگہ لے لی جس وجہ انسان کا فطرت سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ پلازا انسان کے کاروباری رویوں کی علامت بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں فکر و نظر اور جذبات واحساسات کی کوئی اہمیت اور حیثیت باقی نہیں رہی ہے۔ علامتوں کے اس استعمال نے آفتاب اقبال شمیم کی نظم کو انفرادیت بخشی ہے۔ علامتی مفاہیم کی پیچیدگی نے اس نظم کو عام قاری کے فہم کے لیے مشکل بھی بنادیا ہے۔ نظم سے حوالہ:

وہ دیکھتے ہو!
وہاں کبھی ایک باغ ہوتا تھا، جس جگہ پر
کھڑا ہے نوساختہ پلازہ
بلند ہوتا ہوا پلازا
جو قبضہ گیروں کی مافیہ کے
بدن کی خلعت،
سروں کی دستار بن گیا ہے
زمانہ بازار بن گیا ہے [۲۲]

علامت کی تفہیم اسی وقت ممکن ہے جب اس کی ترسیل ہو۔ ترسیل کی ناکامی کی وجہ سے علامت اپنا مفہوم کھودیتی ہے حالانکہ اس میں مفہوم پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس مفہوم کی پردہ دری کی ذمہ داری صرف قاری کے سر رکھنا زیادتی ہے ، کیونکہ قاری کے صاحب ذوق ہونے کی گارنٹی اس وقت تک مشکوک ہے جب تک کہ علامت ترسیل کی حدود میں نہیں آتی۔ اسی لئے علامتوں کے استعمال میں فنی رچاؤ کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔ آفتاب اقبال شمیم اپنی نظموں میں ایسی ہی علامتیں استعمال کرتے ہیں جن سے لفظوں کی معنوی ترسیل آسانی سے ہو جاتی ہے۔ قاری علامت کے ابہام میں کھوتا نہیں بلکہ اس سے لطف واندوز ہوتا ہے۔

آفتاب اقبال شمیم کی نظموں میں تلمیحات موجود ہیں۔ ان تلمیحات کا بڑا حصہ اساطیری کرداروں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے یونانی اور ہندی دیومالائی کرداروں کو بطور تلمیح استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ مچھ تاریخی کردار بھی بطور

تلمیح ان کی نظموں کا حصہ ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم اساطیری و تاریخی کرداروں کو بطور علامت استعمال کر کے نظم کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ تلمیح کی صنعت استعمال کرتے ہوئے کلام میں ایک یا دو لفظ ایسے رکھ دیے جاتے ہیں جو مکمل واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں یا انسانی ذہن کو اس واقعے کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ اگر ایک جملہ یا بیان کسی واقعہ کے متعلق پیش کر دیا جائے تو وہ تلمیح کی بجائے تاریخ بن جائے گا۔ اس حوالے سے ساحر لکھنوی لکھتے ہیں:

> شعر یا نثر میں کسی واقعے کی جانب اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں بشرطیکہ وہ واقعہ کافی مشہور ہو چکا ہو، خواہ خلاف عقل ہو، توہماتی ہو، طلسماتی ہو یا فرضی ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض تاریخی واقعات جب داستانوں کی زینت بن جاتے ہیں تو زیب داستاں کے لیے ان میں بہت سے اضافے بھی ہو جاتے ہیں۔ تلمیح کے بطور جب ان کا حوالہ دیا جاتا ہے تو ان کی وہی افسانوی حیثیت پیش نظر ہوتی ہے جس کے سبب وہ واقعات معروف ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں واقعات کا تجزیہ کرنی کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ [۲۳]

نظم "سنگ بے حیا" تلمیح کے حوالے سے اقتباس:

نینوا کے اندھیرے کنوئیں، دل کے پاتال میں
کوئی برسوں سے گرتی ہوئی چیخ
ہاروت ماروت کو چھو کے لوٹی نہیں [۲۴]

ہاروت و ماروت دو فرشتے تھے جن کے بارے میں کچھ روایات مشہور ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں غصہ اور شہوت دے کر شہر بابل میں اتارا جہاں وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ غصے اور شہوت کے زیر اثر ان دونوں فرشتوں نے ایک خوبصورت عورت کے اکسانے پر شراب پینے، بت کو سجدہ کرنے اور اس عورت کے شوہر کو قتل کرنے کے گناہانِ کبیرہ انجام دیے۔ ان جرائم کی سزا میں دونوں فرشتوں کو زنجیروں میں جکڑ کر اندھے کنوئیں میں جو چاہِ بابل کے نام سے مشہور ہے میں الٹا لٹکا دیا گیا۔ اس کنوئیں میں آگ جل رہی ہے اور ان پر ہر وقت فرشتے کوڑے برساتے رہتے ہیں اور ان کی یہ سزا تا قیامت جاری رہے گی۔ جدید انسان کے تناظر میں انسان کی زندگی کی بے معنویت اور داخلی کرب کے اظہار کی علامت ہیں۔

"ادنیس۔۔۔۔ سفر کی قوس پر" میں ایک ہندی اساطیری کردار کو تلمیح کے طور پر استعمال کیا گیا۔ نظم سے حوالہ:

اے برہما! ترے کھیت کی ٹھنٹھ کیسے اگیں [۲۵]

برہما براہما، ہندی اساطیر کا ایک دیومالائی کردار ہے جو تخلیق کا دیوتا ہے۔ برہما کو "مہاتما اور پتا" بھی کہا جاتا ہے۔ آفرینش کائنات کا تصور اسی سے وابستہ ہے۔ برہما چونکہ ہندی اساطیر میں خالق کی حیثیت رکھتا ہے اسی بنا پر اسے کائنات کے ساتھ ساتھ جملہ مخلوقات کی تخلیق اور سبز و ہریالی سے بھی نسبت دی جاتی ہے۔ جس کی بنیاد پہ نظم کی پیش کی گئی سطر میں برہما کی علامت بمعنی تخلیق کار استعمال کی گئی ہے۔

نظم "سفار تیا" کی سطور کا حوالہ:

تیر جو آخیل کا مزدور تھا

اس کی ایڑھی پر لگا[۲۶]

(Achilles) جسے اردو میں آخیل کہا جاتا ہے۔ یونانی دیومالا کا مشہور ترین کردار ہے اور ہومر کی ایلیاد میں یہ ایک طاقتور ہیرو کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ ایکلیز کی ایڑھی مختلف زبانوں میں استعمال کی جانے والی ضرب المثل ہے۔ اسے کسی طاقت ور ترین فرد کی ہلاکت خیز کمزوری کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یونانی اساطیر کے مطابق اس کا باپ پیلس انا سان جبکہ اس کی ماں تھئیس دیوی تھی۔

نظم "مرحبا" سے تلمیح کی مثال:

کشف منظر کا پیغمبر

توڑتا ہے یاس کے آزر کے بت[۲۷]

نظم کی ان سطور میں آفتاب اقبال شمیم نے حضرت ابراہیمؑ کے چچا آزر کی بابت بات کی ہے جو اپنے زمانے کے مشہور و معروف بت تراش تھے۔ بتوں کو توڑنے کی بات ذہن کو حضرت ابراہیمؑ کے تاریخ کے اس متفقہ واقعے کی طرف منتقل کر دیتی ہے جس کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کو توڑا تھا۔

"نظم رہٹ چلتا ہے" کا حوالہ:

اس مصور کا شہ کار سورج مکھی یوں لگا

جیسے کینوس پہ مرجھا گیا ہو

مجھے مونالیزا زنِ ذہنِ بیمار جیسی لگی[۲۸]

اس سطر میں مونالیزا کو بطور تلمیح کے استعمال کیا ہے جو لیونارڈو ڈی ونچی کی شاہکار پینٹنگ ہے۔ جس میں اس نے مونالیزا کو مسکراتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ تسکانوی مصور لیو نارڈو ڈی ونچی کی مشہور پینٹنگ جس کی مسکراہٹ میں لوگوں کو محو لینے کی خوبی ہے۔ مونالیزہ کی پینٹنگ دنیا کے مشہور عجائب گھر لووغ میں

رکھی ہے، جو فرانسیسی دار الحکومت پیرس میں واقع ہے۔خیال کیا جاتا ہے کہ اس پینٹنگ کو ۱۵۰۳ء اور۱۵۰۶ کے درمیان تیار کیا گیا۔تاہم یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لیونارڈو نے اس پر ۱۵۰۷ تک کام کیا۔

نظم "بخت خاں وار کر!" سے تاریخی تلمیح کا حوالہ:

بخت خاں وار کر!
بخت خاں! وار کر
اس پرانے، زوال آشنا اور اندر کی تخریب و سازش کے
کھائے ہوئے قلعہ کو مسمار کر
اپنی عزت کے منکر کا انکار کر
اور پھر اجنبی فاتحو کے ہراول پہ
یلغار کر
جبر کی ہر کمیں گاہ جن کی حفاظت میں ہے
تیرا انجام ہو گا وہ ہی جو ہوا
پھر بھی اے بخت خاں، اپنے ہونے کا
اقرار کر!
جیت جا ہار کر[۲۹]

اس نظم میں بخت خاں کو تلمیح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔جنرل بخت خان روہیلہ ایک افغان خاندان سے تھے جو کئی پشتوں سے روہیل کھنڈ میں قیام پذیر تھا۔اس خاندان کی جوانمردی اور جان نثاری کی ایک طویل تاریخ تھی۔بخت خان، ۱۷۹۳ء میں بجنور (روہیل کھنڈ) میں پیدا ہوئے۔جوان ہوئے تو انگریزی فوج میں ملازم ہو گئے، کیونکہ وہ نڈر اور بہادر تھے۔بخت خان نے کمپنی کی فوج میں ایک پیادہ دستے کے کمانڈر کے طور پر اپنی خدمات انجام دیں مگر ۱۸۵۶ء میں انھیں برطانوی حکومت نے فوج سے معزول کر دیا۔اس کے بعد جب پہلی جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو وہ انگریز مخالف فوج کے سپہ سالار بن گئے۔بخت خان نے ہی بہادر شاہ ظفر کو فرنگیوں کے خلاف فوج بنانے کا مشورہ دیا تھا جسے ابتدا میں بادشاہ نے مسترد کر دیا تھا۔اس کے بعد انگریزوں کے خلاف بخت خان نے علم بغاوت بلند کیا اور اپنی الگ فوج منظم کر لی اور ایک مدت تک انگریزوں سے لڑتے رہے۔بخت

ایک اہم تاریخی حوالہ ہے جسے اردو شاعری میں بطور تلمیح استعمال بالکل نہیں کیا گیا یا پھر اس قدر کم استعمال کیا گیا کہ عام قاری اس تلمیح کی معنویت سے ناواقف ہے۔

کم سے کم لفظوں میں مفہوم کی ادائیگی نیز اشعار میں بلاغت کا حُسن پیدا کرنے کے لیے تراکیب بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو شاعری میں ترکیب سازی کا رجحان ابتدا سے لے کر اب تک برابر چلا آ رہا ہے۔ شعرا ان تراکیب کے ذریعہ دو چیزوں یا دو خیالوں کے درمیان رشتہ قائم کرتے ہیں اور جہاں کہیں اس میں مماثلت کا پہلو ہوتا ہے وہاں مرکب لفظ ایک نیا استعارہ بن کر اُبھرتا ہے۔ شاعری میں محبوب یا ممدوح کے اوصاف کے اظہار میں تراکیب اہم ترین کردار ادا کرتی ہیں۔ تلمیحی تراکیب اشعار میں ایک تمکنت اور وقار کا درجہ رکھتی ہیں۔

آفتاب اقبال شمیم اپنے تصورات و خیالات کو اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ قاری کے ذہن پر نقش کرنے کی خاطر مروج و مستعمل تراکیب و اصطلاحات ہی کو استعمال میں نہیں لاتے بلکہ نئی تراکیب سازی کے نئے عمل سے بھی گزرتے ہیں۔ یہ عمل ایک تخلیقی اور شاعرانہ عمل ہے اور یہ بھرپور تخلیقی قوت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ایک وسیع المطالعہ اور زبان کے لسانی نظام پر حاوی ہونے کی وجہ سے آفتاب اقبال شمیم ایک شاعرانہ خیال کو نئی تراکیب کے ساتھ زیادہ موثر اور معنی خیز انداز میں پیش کرتے ہیں۔

آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم "بند دروازے میں کرن کی درز" میں جدید انسان کی مجبوریوں اور پریشانیوں کی منظر کشی کرتے ہیں۔ اس نظم میں وہ یہ کہتے ہیں کہ زندگی طولانی راہوں سے گزرتی ہے جہاں اسے بے شمار مصائب کا سامنا ہوتا ہے۔ جدید عہد میں انسان کے لیے اتنی مشکلات ہیں کہ وہ اپنی شناخت کھو بیٹھا ہے۔ خواب کی مشعل وہ ترکیب کے طور پر استعمال کرتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ انسان اپنی تمام تر مشکلات کے بعد امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ نظم سے ترکیب کا حوالہ:

خواب کی مشعل ہاتھ میں لے کر چلتا ہوں [۳۰]

نظم "چوکور دستک اور صلیب" سے حوالہ:

جب جسم تراٹیں مارے گا
اور روح پچھل پائی کی طرح پچھواڑے میں
چلائے گی

جب ریت کی پیاس سلیٹی سی، ہونٹوں کی پپڑی کے نیچے
ایسا کہرام مچائے گی
کہ بیٹے اپنے باپوں کی پہنائی ہوئی زنجیروں کو
ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے [۳۱]

اس نظم میں 'جسم کی تراٹیں'، 'روح کی پچھل پائی' اور 'ریت کی پیاس' کی تراکیب جدید انسان کے مصائب و کرب کو بیان کرتی ہیں۔ یہ کیفیات عرفان ذات اور خود آگہی کی منازل طے کرتے وقت انسان محسوس کرتا ہے۔ یہی کیفیت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی پرانی نسل کی روایات سے قطع تعلق کر لے۔ انسانی وجود کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنی روایات اور اقدار خود تخلیق کرنا چاہتا ہے۔

نظم "نہیں اور ہاں سے آگے" سے حوالہ:

یہ فکر و جذبہ و احساس بے معنی نہیں ہے
ہم دیے کی لو کو جب انگلی سے چھوتے ہیں
تو کیسا کرب اپنی چھاپ سی
قرطاس جاں پر چھوڑ جاتا ہے
ذرا تو بھی چراغِ ہست کو چھو کر
لگا اندازہ کیسے روشنی کی بوند دل میں
درد کی لہریں اٹھاتی ہے [۳۲]

ان سطور میں چراغ ہست، ناآفریدہ شہروں کی تراکیب استعمال کی ہیں۔ فرد کو چراغ ہست کو چھونے سے درد کی لہروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی طرح انسان کو زندگی کے حوالے سے ہمیشہ ناآفریدہ شہروں کا سفر درپیش ہوتا ہے۔ یہی انسانی زندگی ہے۔ زندگی کے ان مراحل کو طے کرنے میں انسان کو مسلسل کرب واذیت کا سامنا رہتا ہے۔

اُردو زبان میں دیگر زبانوں کے استعمال کے وقت زبان و الفاظ کے استعمال کی موجودہ صورتِ حال اور عصری تقاضوں کو بھی مدّ نظر رکھنا پڑتا ہے ہمارے ہاں انگریزی کے لاتعداد الفاظ ایسے بھی ہیں جو روز مرّہ کی بول چال کا حصہ ہیں اور جنکے متبادل الفاظ اُردو میں موجود ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم نے بھی اپنی نظموں میں انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ ان کی نظموں سے انگریزی الفاظ کی مثالیں پوسٹر ہیرو، سن شائن، فیکٹری، گیلری، میڈیا، سسپنس، سینار یو، ڈیتھ وش، ایوری باڈی نو باڈی وغیرہ ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم شہزاد،فرہنگ ادبیات،(مالیگاؤں:منظر نما پبلیشرز،۱۹۹۸ء)،ص ۸۲۔

۲۔ طارق سعید،االسلوب اور اسلوبیات،(لاہور:نگارشات،۱۹۹۸ء)،ص ۶۳۔

۳۔ مرزا خلیل بیگ،زبان ،اسلوب اور اسلوبیات،(علی گڑھ:ادارہ زبان واسلوب، ۱۹۸۳ء)، ص ۱۶۰۔

۴۔ آفتاب اقبال شمیم۔نادر یافتہ : کلیات ،سعید احمد (مرتب)،(اسلام آباد : پورب اکادمی ۲۰۱۶ء)، ص ۴۰۔

۵۔ ایضاً،ص ۳۱۔

۶۔ ایضاً،۳۸۷۔

۷۔ ایضاً،ص ۱۱۴۔

۸۔ ایضاً،ص ۴۷۔

۹۔ ایضاً،ص ۱۸۶۔

۱۰۔ ایضاً،ص ۲۲۳۔

۱۱۔ ایضاً،ص ۴۶۸۔

۱۲۔ ایضاً،ص ۵۲۵۔

۱۳۔ ایضاً،ص ۷۰۷۔

۱۴۔ اسرااحمد،غالب کی شاعری میں تشبیہات و استعارت،(پٹنہ:ادبستان رانی گھاٹ، ۱۹۸۷ء)، ص ۴۶۔

۱۵۔ آفتاب اقبال شمیم۔نادر یافتہ : کلیات ،سعید احمد (مرتب)،(اسلام آباد : پورب اکادمی، ۲۰۱۶ء)،ص ۱۷۱۔

۱۶۔ ایضاً،ص ۷۶۸۔

۱۷۔ انیس اشفاق،اردو غزل میں علامت نگاری،(لکھنو:اترپردیش اردو اکادمی،۱۹۹۵ء)،ص ۲۳۔

۱۸۔ آفتاب اقبال شمیم۔نادر یافتہ : کلیات ،سعید احمد (مرتب)،(اسلام آباد : پورب اکادمی

،۲۰۱۶ء)، ص ۲۵۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۹۸۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۲۵۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۷۷۷۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۷۷۸۔

۲۳۔ ساحر لکھنوی، مختصر فرہنگ تلمیحات و مصطلاحات، (لکھنو: ارتقاء پبلشرز، ۱۹۸۶ء)، ص ۷۔

۲۴۔ آفتاب اقبال شمیم۔نادر یافتہ : کلیات ، سعید احمد (مرتب)، (اسلام آباد : پورب اکادمی ۲۰۱۶ء)، ص ۳۱۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۸۲۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۸۷۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۳۷۱۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۶۱۲۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۶۶۲۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۱۲۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۴۵۔

ماحصل

ماحصل

زیر نظر تحقیقی مقالے میں آفتاب اقبال شمیم کی نظم میں عصری حسیت کا مطالعہ کیا گیا ہے۔اس حوالے سے احتشام علی کی کتاب جدید اردو نظم میں عصری حسیت سے ایک نظری خاکہ تشکیل دیا گیا ہے جس کی مدد سے آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کا عصری حسیت کے تناظر میں احاطہ کیا گیا ہے۔آفتاب اقبال شمیم کا شمار اردو ادب کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔جب انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز کیا تو وہ اقبال اور اختر شیرانی کے حصار میں تھے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ فیض احمد فیض اور نذر محمد راشد (ن۔م راشد) سے متاثر ہوئے۔ آفتاب اقبال شمیم فکری سطح پر راشد کی ناآسودگیوں کے ادراک ،مضطرب کر دینے والے رجحان اور تاریخ کے جبریت کے احساس سے متاثر تھے۔اسی طرح فیض احمد فیض کی شاعری میں مظلوم و محکوم کے ساتھ یکجہتی،عالمی سطح پر استعمار سے آزادی کی جو جہد کرنے والے ایشیائی،افریقی اور لاطینی امریکی ممالک کی حمایت اور حسن وانقلاب کو ایک ہی شعر میں سمو نے کی جمالیاتی کاوش کو اپنی فکری بالیدگی میں سمو لیتے تھے۔۔آفتاب اقبال شمیم ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے مگر اسے من وعن قبول نہیں کیا۔ اب تک آفتاب اقبال شمیم کے پانچ نظمیہ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ان کے یہ شعری مجموعے فنی وفکری اعتبار سے عصری حسیت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

عصری حسیت سے مراد انسان کی فطرت کی طرف تجربات پر فطری رد عمل ہے۔عصری حسیت کا شاعر اپنے داخلی اور خارجی تجربات کو بیان کرتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے معاشرے میں پھیلے اضطراب،تنہائی اور کرب کا مشاہدہ کرتا ہے اور شاعری کے منظر نامے پر جدوجہد،اس کی محنت اور اس کی بد قسمتی کی داستان بیان کرتا ہے۔ جدید نظم کا شاعر باغی ہے۔وہ دنیا کے نام نہاد سیاسی،معاشی،مذہبی اور اقتصادی نظام کی بدانتظامیوں اور بد عنوانیوں کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔عصری حسیت کا شاعر مثبت یا منفی طرز عمل رکھتا ہے جو اسے اپنی زندگی کے عملی اور نظریاتی تجربات سے حاصل ہوا۔وہ اپنی منطق کے مطابق ان تجربات پر اپنا رد عمل ظاہر کرتا ہے۔اس سے یہ ظاہر ہوا کہ حسیت کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے۔شاعر اپنے کچھ تخیلاتی تجربات سے بھی گزرتا ہے یا ایسے تجربات سے جن کا تعلق اس کی داخلی زندگی سے ہوتا ہے۔کوئی بھی انسان جب اپنی سوچ اور عقل کے مطابق ان تجربات کو بیان کرے تو اس کی حسیت ہو گی۔

زیر نظر تحقیقی مقالے کے باب اول میں آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کے موضوعات میں عصری حسیت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ان کی نظموں کے موضوعات ایسے ہیں جو عصری حسیت کے مختلف عناصر کو اپنے اندر

سموئے ہیں۔ان کی نظم آدم زاد کی دعا" ہے جس کا موضوع عصر حاضر کے انسان کو درپیش مسائل ہیں۔ حاکم وقت نے انسان کے لیے زمین تنگ کر دی ہے جس کا شکوہ وہ تقدیر سے کرتے ہیں۔ بظاہر ایک ترقی یافتہ دنیا خوشحالی کی بلندی پر ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں سائنس انسان کے لیے سہولیات پیدا کیں وہاں بہت سے مسائل بھی پیدا کیے ۔جدید انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اس کے عدم تحفظ کا احساس ہے۔ نظم "زید آ" آفتاب اقبال شمیم کی کرادری نظم ہے جس میں وہ کردار سے مکالماتی انداز میں مخاطب ہیں۔شاعر مختلف حسیات کی منظر کشی کرتے ہیں۔ جدید دور کا انسان اپنی ذات کی لایعنیت کا شدت سے محسوس کرتا ہے۔لایعنیت کا یہ رویہ جدید فلسفے کا ایک غالب ذہنی رویہ ہے۔اسی طرح ان کی نظموں میں عصری حسیت کے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

آفتاب اقبال شمیم نے اپنی نظموں میں عصری حسیت کے تناظر میں بین الاقوامی منظر نامے پر سامراجیت سے ہونے والے ظلم و جبر ،استحصال اور تشدد پر فکر انگریز نظمی بیانیہ تشکیل دیا ہے۔ طاقت ور ممالک کمزور ممالک پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے اپنا سیاسی اور معاشی اثر ورسوخ استعمال کرنے کے لیے ایک نظام یا طریقہ کار وضع کرتے ہیں۔اسے سامراجیت (Imperialism) کا نام دیا جاتا ہے۔ سامراجی نظام اجارہ داری کی مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے جیسے زبان پر اجارہ، تعلیمی نظام پر، سیاست پر، معیشت پر ،مذہب پر، تہذیب و ثقافت پر ،ذہن پر ،نفسیات پر اور ادب پر۔ نوآبادیات کو بھی سامراجیت کی ایک شکل قرار دیا جاتا ہے۔ مغربی ممالک کا سامراجی نظام قائم کرنے کا مقصد پسماندہ اور غریب ممالک کی معدنیات، تیل، گیس اور دیگر وسائل کو کوڑیوں کے بھاؤ خریدنا ہے۔

عالمی سامراج نے دنیا کے انسانوں کو تقسیم کر کے رنگ و نسل اور مذہب، فرقہ اور زبان و لسان کی بنیاد پر سرحدیں قائم کر دی ہیں۔ دنیا ایک تھی، کوئی طبقہ تھا اور نہ کوئی ریاست۔ صاحب جائیداد طبقات نے دنیا کو تقسیم کیا۔ کچھ لوگوں کو برہمن، سردار، وڈیرہ، ارب پتی اور کھرب پتی بنا دیا اور بیشتر لوگوں کو مزدور، کسان، دھوبی، گاڑی بان، نائی، چمار، موچی، کمی، ہاری، مسلی، بھنگی بنا دیا۔ اسی بنیاد پر دولت مندوں کو عقل مند اور استحصال زدہ لوگوں کو کم عقل اور نیچ قرار دیا۔ غیر طبقاتی سماج پچاس ہزار برس پر مشتمل تھا، جب کہ طبقاتی سماج چھ ہزار سال پر مشتمل ہے۔

سامراجیت کا شکار وہ ممالک ہیں جہاں جہالت اور قدامت کا راج ہو، اسلاف پرستی اور مذہبی انتہا پسندی عروج پر ہو، لوگ بین الاقوامی حالاتِ حاضرہ سے لاتعلق ہو کر معمولی اور گھٹیا نوعیت کی گتھیاں سلجھانے میں الجھے ہوں، اجتماعیت کے بجائے انفرادیت کا راج ہو، قومی زندگی کے رگ و ریشے میں کرپشن کا زہر لہو کی طرح گردش کرے، حکمران اپنے قومی اختیارات کا استعمال ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے کریں، میرٹ نام کی کوئی شے کہیں

دکھائی نہ دے، تجدید اور ایجاد کی راہیں مسدود کر دی جائیں، سائنس و ٹیکنالوجی کا پیڑ اپنی جڑوں تک سوکھ جائے، عوام کو بالعموم اور اشرافیہ کو بالخصوص کھانے اور پہننے کی عادت پڑ جائے تو ترقی کے راستے معدوم ہوتے ہیں۔

آفتاب اقبال شمیم کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن میں انھوں نے عالمی سطح پر سامراجیت اور ردِ سامراجیت کی منظر کشی کی ہے۔ "بے زور آور ان کی ایسی نظم ہے جس میں انھوں نے سامراجی طاقتوں کی اشتعال انگیز گولہ باری کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کی گولہ باری سے معصوم نہتے شہریوں کی رہائش گاہیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ لوگ بے گھر ہو جاتے ہیں۔ گولوں کی آوازوں سے پورے علاقی کی دیواریں لرز اٹھتی ہیں۔ لوگ اس گولہ باری کے خوف سے نئی پناہ گاہیں تلاش کرنے لگتے ہیں۔ بے چارے معصوم شہری ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹتے ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم جہاں مغربی سامراج پر طنز کرتے ہیں وہاں وہ تیسری دنیا کے ممالک کو بھی تنقید کی زد میں لاتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر غریب اور پسماندہ ممالک خود کفیل ہوں، انہیں امداد کی بھیک نہ مانگنی پڑے اور انہیں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے بار بار اپنا کشکول ان کے سامنے نہ کرنا پڑے تو یہ سامراجی طاقتیں کبھی بھی غریب ممالک کا استحصال نہ کریں۔

نظم "گرتے ستون کا منظر" ملکی سطح پر سامراجیت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس نظم میں وہ پاکستان کے عظیم سیاسی لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر لٹکانے کا منظر سامراجی نظام کے تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ تاریخ آج بھی اس سانحے پر نوح کناں ہیں۔ کئی عالمی سربراہاں نے نے جرنل ضیاء الحق سے درخواست کی کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں اور اس عظیم رہنما کو ملک بدر کر دیں۔ اس نظم میں آفتاب اقبال شمیم نے اس جادوئی شخصیت رکھنے والے اس عظیم لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی پر اپنے کلام کو اس جبر کے خلاف بطور ہتھیار پیش کیا۔

افریقہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اگلے محاذ پر" آفتاب شمیم کی وہ نظم ہے جس میں انھوں نے افریقی عوام پر سامراجی طاقتوں کے ظلم و ستم کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے یہ نظم افریقہ کی جنگ آزادی کے پس منظر میں لکھی ہے جو ان کی عالمی بصیرت کی گواہی اور اعلیٰ شاعری کا نمونہ ہے۔ ماضی میں اس کی کئی نسلیں انسانی لالچ، طاقت کے خمار، قدرتی وسائل پر قبضے اور نسل پرستی کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ طاقت و معاشی کھینچا تانی میں براعظم افریقہ کے لوگ آج بھی دنیا میں انسانی حقوق کے علمبرداروں کے سائے میں اپنی رنگت اور نسل کی وجہ سے مسائل سے دوچار ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم اپنی نظم "رہٹ چلتا ہے" میں تیسری دنیا پر سامراجی طاقتوں کے فضائی حملوں کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ تیسری دنیا میں وہ ممالک شامل ہیں جو غریب، پسماندہ، مفلوک الحال اور ترقی پذیر ممالک ہیں۔ تیسری دنیا کے معاشی حالات خراب ہونے میں مغربی ممالک کی مداخلت کا بھی تو دخل ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک کو آئی۔ ایم۔ ایف نے بری طرح

قرضوں میں جکڑ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے ہر شعبہ زندگی میں بے جا مداخلت کر کے اپنا اثر ورسوخ قائم رکھتے ہیں۔ قرضوں کی وجہ سے تیسری دنیا کے ممالک غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

آفتاب اقبال شمیم نے اپنی نظموں میں جدید انسان کے عصری مسائل کو پیش کیا ہے۔ جدید انسان ترقی کی بلندیوں پر پہنچنے کے باجود طرح طرح کی مسائل کا شکار ہے۔ جدید انسان کے لیے قرب کی کیفیت سے گزرنا انتہائی مشکل ہے۔ انسان میں یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کا انسانیت سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں سے بد گمان ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ جدید دور کا انسان مستقبل کے بارے میں فکر مند رہتا ہے اور خاص امیدوں اور توقعات کے سہارے فیصلے نہیں کرتا کیونکہ امکانات کی موجودگی میں فیصلہ کرنا اور اس کی ذمہ داری قبول کرنا اس کی مجبوری ہے۔ مستقبل تاریکی میں ہوتا ہے اور اس تاریک صورت حال میں جب نتائج کا اندازہ نہیں ہوتا تو انسان پر مایوسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اکتاہٹ کا عمل انسان کی داخلی کیفیت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دراصل ہر لمحہ انسان کو اپنے ادھورے پن اور نامکمل پن کا احساس رہتا ہے اور اسے تکمیل ذات اپنے آپ سے بہت دور محسوس ہوتی ہے یوں وہ خوب سے خوب تر کا متلاشی ہوتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں اسے مسلسل جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ تو اس لیے وہ ہر لمحہ اکتاہٹ کا شکار بھی ہوتا ہے۔

نفرت بھی جدید انسان کا مسئلہ ہے۔ نفرت ایک منفی جذبہ ہے جس کی وجہ باغیانہ جذبات ہوتے ہیں۔ یہ جذبات کسی شخص، ملک، مذہب، نظریے، عقیدے اور سوچ کے خلاف ہو سکتے ہیں۔ نفرت کی موجودگی اکثر غصے، اطراف کے ماحول یا کثرت سے تعلق میں آنے والے لوگوں سے دل برداشتہ ہونے یا رویے یا طرز عمل کے استعمال سے جڑی ہے۔ بعض اوقات انسان اس نفرت کی وجہ سے اندھا ہو جاتا ہے اور اس کی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ ماحول کی ابتری اور حالات کی خرابی کی وجہ سے جدید انسان داخلی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ داخلی کشمکش میں مبتلا انسان اپنے اندرونی جذبات واحساسات کو اہمیت دیتے ہیں جبکہ ان کے گردونواح میں حالات اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ اضطراب ایک تکلیف دہ جذباتی کیفیت ہے جس سے آج کا انسان دوچار ہے۔ اس کیفیت کی وجہ سے وہ ہر وقت پریشان ہو جاتا ہے۔ جدید انسان اجنبیت کا شکار بھی ہے۔

نظم "طلسم بے اسم" میں عصر حاضر کا انسان داخلی کرب میں مبتلا ہے جو اسے گردونواح کی دنیا سے ملتا ہے۔ اس کرب کی وجہ سے وہ اکیلے پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ انسان اپنے تخیل سے کچھ ایسی صورتیں گڑھ لیتا ہے جسے وہ ہر تلاش کرتا ہے۔ جدید انسان ایسے خواب دیکھتا ہے کہ شاید جس کی تعبیر ہمارے مادی سماج میں ممکن نہیں ہوتی۔ اس کے یہ خواب جو دراصل اس کی خواہشات نفس ہیں وہ ان کے پیچھے اندھا دھند

بھاگتا ہے۔ جب اسے اپنے خوابوں کی تعبیر نہیں ملتی تو وہ ذہنی کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ "خود کلامی کے کٹہرے میں" میں آفتاب اقبال شمیم نے ایسے جدید انسان کا تصور دیا ہے جو اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑا اپنے مصائب و مسائل کا جواز تلاش کر رہا ہے۔ عصر حاضر کا انسان عجیب داخلی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ نئی تبدیلیوں کی یلغار کی وجہ مختلف اندیشوں میں گرفتار ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے جہاں انسان کی زندگی کو پر آسائش بنا دیا ہے وہاں اس کے لیے بہت سے مسائل کو جنم دیا ہے۔ وقت کا مسیحا نہایت مشفقانہ اور درد بھرے لہجے میں جدید انسان کو وقتی مصائب پر صبر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

"روشنی نا روشنی" میں آفتاب اقبال شمیم معاشرے میں پھیلتی بے حسی، بے یقینی، ناآسودگی اور سمجھوتے کو موضوع بنایا ہے۔ جب معاشرے میں انصاف نہیں ہوتا تو بے یقینی اور بے حسی کی فضا جنم لیتی ہے۔ جدید مشینی دور میں معاشرے میں اجنبیت اور تنہائی کو فروغ دیا ہے۔ معاشرے میں ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے۔ جدید انسانی معاشرہ اخلاقیات سے عاری ہوتا جا رہا ہے۔ پرانی قدریں دم توڑ رہی ہیں۔ انسان کو زندگی کی گاڑی کو چلانے کے لیے نا چاہتے ہوئے بھی بہت سے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں اسی وجہ سے وہ داخلی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ "مات کی ایک واردات" میں آفتاب اقبال شمیم دہشت گردی سے پیدا ہونے والے خوف سے خوف زدہ عصر حاضر کے انسان کی کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ منظم منصوبے کے تحت مقاصد کے حصول کے لیے پر تشدد کارروائی دہشت گردی ہے۔ دہشت گردی بھی ایک ایسا قابل نفرت اور برا عمل ہے جو بہت تیزی سے اس دنیا میں پھیل رہی ہے اور اس کو جتنا زیادہ روکنے کی کوشش کی جا رہی وہ اتنا ہی تیزی سے پوری دنیا میں پھیل رہی ہے۔ اس کا کوئی علاقہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی مذہب۔ اس کی جڑیں ہر رنگ نسل اور ہر علاقہ، مذہب، قوم اور ملک میں موجود ہیں۔

زیر نظر مقالے میں آفتاب اقبال شمیم کی نظموں کے اسلوب میں عصری حسیت کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ اسلوب کے تشکیلی عناصر میں خیال اور زبان کی خصوصیات شامل ہوتی ہیں۔ کوئی مصنف یا شاعر زبان و بیان کے مخصوص الفاظ، تشبیہات، استعارے اور تراکیب کو مخصوص انداز میں یا اکثر استعمال کرتے ہوئے اپنے منفرد اسلوب کی صورت گری کرتا ہے۔ آفتاب اقبال شمیم نے تشبیہات، استعاروں، تراکیب، علامتوں، مکالماتی انداز، ڈرامائی انداز اور انگریزی الفاظ کی معنویت اپنی نظموں کی ساخت میں منقلب کیا۔

کتابیات

کتابیات

آغا،وزیر۔تنقید اور جدید اردو تنقید۔کراچی: مطبع احمد گرافکس،۱۹۸۹ء۔

آغا،وزیر۔اردو شاعری کا مزاج۔لاہور: مجلس ترقی ادب اردو،۱۹۷۴ء۔

احمد،ندیم۔ترقی پسند ،جدیدت ،مابعد جدیدت۔دہلی: بھارت آفسیٹ،۲۰۰۲ء۔

احمد دہلوی،سید۔فرہنگ آصفیہ۔لاہور: مکتبہ حسن سیہل لمیٹڈ،۱۹۷۴ء۔

اسرار،احمد۔غالب کی شاعری میں تشبیہات و استعارات۔پٹنہ: دبستان رانی گھاٹ،۱۹۸۷ء۔

اعظمی،منظر۔اردو میں شعری زبان کی اصلاحی کوششیں۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،۱۹۸۸ء۔

امجد،رشید۔جدید ادبی تناظر۔راولپنڈی: الفتح پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء۔

اشفاق،انیس۔اردو غزل میں علامت نگاری۔لکھنو: اترپردیش: اردو اکادمی،۱۹۹۵ء۔

ایوبی،منظر۔اردو شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش۔پاکستان: انجمن ترقی اردو،۲۰۱۰ء۔

ازفر،عمران۔نئی اردو نظم ،نئی تخلیقی جہت ۔اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۱۳ء۔

بیگ،مرزا خلیل۔زبان ،اسلوب اور اسلو بیات ۔علی گڑھ: ادارہ زبان واسلوب،۱۹۸۳ء۔

بیگ،مرزا خلیل۔اطلاقی لسانیات۔علی گڑھ: مسلم یونی ورسٹی،۲۰۰۳ء۔

بیگ،افتخار۔وجودیت اور اردو شعری طرز اظہار۔اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۱۶ء۔

جمال،انور۔ادبی اصطلاحات۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۱۵ء۔

جاوید، قاضی۔معاصر مغربی فلسفے کا تعارف۔لاہور: نگارشات،ندارد۔

چشتی،عنوان۔اردو شاعری میں جدیدت کی روایت،اردو سماج ۔نئی دہلی: جامعہ نگر،۱۹۷۷ء۔

حنفی، شمیم۔نئی شعری روایت۔نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۰۵ء۔

خواجہ اکرام الدین، محمد۔اردو کی شعری اصناف۔دہلی: شعبہ اردو،ندارد۔

سعید،ایڈورڈ ۔Culture and Imperialism۔نیویارک: نوف،۱۹۹۳ء۔

سعید،طارق۔اسلوب اور اسلوبیات۔لاہور: نگارشات،۱۹۹۸ء۔

سرور، آل احمد۔نظر اور نظریے۔دہلی: کوہ نور پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۳ء۔
شاکر، امجد علی۔اردو ادب تاریخ و تنقید۔لاہور: عزیز پبلیشرز، ۱۹۹۲ء۔
شمیم، آفتاب اقبال۔ نادر یافتہ (کلیات)۔سعید احمد (مرتب)۔اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۶ء۔
شمیم، آفتاب اقبال۔فرد نژاد۔اسلام آباد: ثبات پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء۔
شمیم، آفتاب اقبال۔زید سے مکالمہ۔اسلام آباد: ثبات پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء۔
شمیم، آفتاب اقبال۔میں نظم لکھتا ہوں ۔اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء۔
شمیم، آفتاب اقبال۔گم سمندر۔اسلام آباد: ثبات پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔
شمیم، آفتاب اقبال۔ممنوعہ مسافتیں۔اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۶ء۔
شہزاد، سلیم۔فرہنگ ادبیات۔مالیگاؤں : منظر نما پبلیشرز، ۱۹۹۸ء۔
علی، احتشام۔جدید اردو نظم میں عصری حسیت۔لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء۔
عابد، علی عابد۔اسلوب۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء۔
فیروز الدین، مولوی۔فیروز اللغات۔لاہور: اردو جامعہ، ۲۰۰۵ء۔
فتح پوری، فرمان۔اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ۔لاہور: وکٹری بک بینک، ۱۹۹۰ء۔
لطف الرحمن۔جدیدت کا آغاز۔مشمولہ اردو فسانوی ادب۔نامعلوم (مرتب)۔پٹنہ: بہار اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء۔
لکھنوی، ساحر۔مختصر فرہنگ تلمیحات و مصطلاحات۔لکھنو: ارتقاء پبلیشرز، ۱۹۸۶ء۔
محمود، ساجد۔اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات۔لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔
ناشاد، ارشد محمود۔اصناف ادب : تفہیم و تعبیر (منتخب تنقیدی اقتباسا ت)۔اسلام آباد: گل اعوان پرنٹرز، ۲۰۱۶ء۔
نارنگ، گوپی چند۔ادبی تنقید اور اسلوبیات۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء۔
نارنگ، گوپی چند۔اردو زبان و لسانیات۔رامپور: رضا لائبریری، ۲۰۰۶ء۔
ہاشمی، طارق۔اردو نظم اور معاصر انسان۔اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۵ء۔
ہاشمی، طارق۔اردو نظم کی تیسری جہت ۔لاہور: شوکت پرنٹرز، ۲۰۰۳ء۔

آفتاب اقبال